پریڈ گراؤنڈ

پریڈ گراؤنڈ

از

هنسراج رہبر

لاجپت رائے اینڈ سنز اردو بازار دہلی

تعداد ۱۱۰۰   سنہ ۱۹۵۳ء   قیمت 2/4/

جنہیں شک ہو وہ کریں اور خداؤں کی تلاش
ہم تو اِنسان کو دُنیا کا خُدا کہتے ہیں

فراق

(۱)

فضا خاموش ہے اور رات بھیگی ہوئی ہے۔ کوشل پریڈ گراؤنڈ میں بیٹھا اوپر آسمان کی طرف جھانک رہا ہے۔ آسمان پر تارے چھٹکے ہوئے ہیں۔ بادلوں کا نام و نشان نہ ہوتے ہوئے بھی مطلع صاف نہیں ہے۔ چاروں طرف دھندلاہٹ چھائی ہوئی ہے۔ جیسے دھواں ماحول میں رچ بس گیا ہو۔ اس کا ایک لازمی جزو بن چکا ہو۔

اُوپر آسمان اور نیچے یہ میدان پھیلا ہوا ہے۔ کوشل نے ان جانے ہی گھاس کا ایک تنکا توڑ لیا ہے اور وہ اسے دانتوں میں لے کر چبا رہا ہے۔ وہ شاید سوچ رہا ہے کہ میں اتنی رات گئے تک یہاں کیوں بیٹھا ہوں؟ اس سے پہلے اس کے ذہن میں بیک وقت بہت سے خیالات

اٹھ رہے تھے ——— خیالات کے گھوڑے دوڑ رہے تھے۔ اور وہ نہایت پریشان اور اداس تھا۔ لیکن اب صرف یہی ایک بات سوچنے کی رہ گئی ہے اور یہ بھی کوئی اہم مسئلہ نہیں ہے۔ پہلے بھی بہت مرتبہ اس بات پر غور کر چکا ہے اور وہ صرف غور ہی کرنا چاہتا ہے۔ کسی نتیجے پر پہنچنا اسے منظور نہیں ہے۔ کیونکہ یہاں بیٹھنے کا اگر کچھ مقصد ہو تو شاید وہ لطف محسوس نہ ہو۔ جو اس وقت محسوس ہو رہا ہے۔ اسے صرف بیٹھے رہنا اور ان جانی وسعتوں میں جھانکتے رہنا عزیز ہے۔ میدان سے اسے کچھ عشق ہو گیا ہے۔ جب وہ اندھیرے میں جھانکتا ہے تو اسے میدان کی وسیع روح کروٹیں لیتی ہوئی جان پڑتی ہے اور خاموش فضا میں سرگوشیاں سی سنائی دیتی ہیں۔ یہ سرگوشیاں پُر معنی ہیں۔ کسی غیر فانی عظمت کی مظہر ہیں۔ وہ اپنی روح میں اس عظمت کا لمس محسوس کرنے لگتا ہے ——— شاید اس لیے اسے انجانی وسعتوں میں جھانکتے رہنا عزیز ہے۔

دو سال پہلے وہ ایک خانماں برباد کی حیثیت سے دہلی میں وارد ہوا تھا۔ اس کا کوئی سہارا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ اور اس نے اپنی ہی طرح کچھ دوسرے ساتھیوں کے ہمراہ اس میدان کی کھلی فضا میں سونا شروع کیا تھا۔ اس سے پہلے بھی وہ بارہا آوارہ گھوما تھا۔ مختلف جگہوں اور شہروں میں رہ کر بہت سے نئے نئے اور مختلف مزاج لوگوں سے واقفیت حاصل کی تھی۔ یوں اس نے تجربے اور مشاہدے سے سماج، زندگی اور اس

کے فلسفے کے انیک پہلوؤں کو بخوبی سمجھ لیا تھا۔ اسی لئے سارے ہنگامے میں اس کی روح کچھ زیادہ سٹپٹائی نہیں تھی اور لیکا یک میدان میں سوتے ہوئے چنداں تکلیف بھی محسوس نہیں ہوئی تھی۔ لیکن اس کی زندگی میں یہ ایک بالکل نیا تجربہ تھا۔ جن لوگوں سے جہاں متعارف ہونا پڑا تھا۔ ان کے ساتھ یوں اٹھنے بیٹھنے کا کبھی خیال بھی اس کے ذہن میں نہیں آیا تھا۔ وہ انہیں بہت ہی حقیر اور ذلیل تصور کرتا تھا۔ انسان کی تمام کمزوریوں اور برائیوں کا سماج کو ذمے دار سمجھتے ہوئے کبھی وہ ان سے نفرت کرتا تھا۔ وہ بھی انسان ہیں۔ ان میں بھی انسانیت ہے۔ کوئی سچائی اور غیر فانی عظمت ہے۔ یہ وہ تسلیم کرنے کو تیار نہیں تھا۔

لیکن گذشتہ دو سال کے واقعات اور حالات نے اس پر نئی حقیقتوں کا انکشاف کیا ہے۔ نئے تعلقات نے زندگی کے بارے میں نئی سوجھ بوجھ پیدا کی ہے اور بہت سی ذہنی الجھنوں کو صاف کر دیا ہے۔ سماج اور انسان۔ سکھ اور دکھ اور نفرت اور محبت کے بارے میں اس کا نظریہ یکسر بدل گیا ہے جیسے یہ ایک نئی زندگی کا آغاز ہو۔ جیسے اس کے پورے شعور اور تمام تصورات نے نیا جنم لیا ہو۔ جیسے یہ سب کچھ اس میدان کی دین ہو۔ اس لئے اسے میدان سے عشق ہو گیا ہے۔

وہ اب خانماں برباد نہیں ہے۔ اسے ایک کمرہ مل گیا ہے۔ جہاں وہ اپنی ہی طرح کے ایک محنت کش دوست کے ساتھ رہتا ہے۔ اس کا یہ دوست شاعر ہے۔ جو امن، آزادی اور خوشحالی اور پُرمسرت زندگی کے

گیت لکھتا ہے۔ انسان کے حسین اور شاندار مستقبل کی باتیں کرتا ہے۔ یہ گیت اور یہ باتیں اسے پسند ہیں۔ لیکن ان گیتوں اور ان باتوں سے بھی کہیں زیادہ حظ اور کہیں زیادہ مسرت اسے میدان کی ان وسعتوں میں جھانک کر اور اس کی سرگوشیاں سن کر حاصل ہوتی ہے۔

ٹھیک ہے کہ وہ اب اس میدان میں سونے کے لئے مجبور نہیں ہے لیکن جب اس کا کوئی سہارا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ تو اس میدان نے اسے اپنی محبت بھری آغوش میں پناہ دی تھی۔ اسے اپنی عظمت سے روشناس کر دیا تھا۔ سرگوشیوں میں ارتقاء پذیر سچائی کا راز بتایا تھا۔ وہ اس کے لئے میدان کا ممنون ہے۔ اس میں اور میدان میں ماں اور بیٹے کا سا رشتہ قائم ہو چکا ہے۔ وہ سرد اور خاموش راتوں میں اس کی آغوش میں بیٹھے رہنا پسند کرتا ہے۔ اس کی پُر معنی سرگوشیاں سن کر اس کا دل مسرت سے ناچ اٹھتا ہے اور زخمی اور مغموم روح کو تسکین حاصل ہوتی ہے۔

کوئی ناخوشگوار واقعہ ہو جائے اس کے دل کو کوئی بڑا صدمہ پہنچے تو وہ یہاں آ بیٹھتا ہے۔ چپ چاپ بیٹھا رہتا ہے۔ رفتہ رفتہ تمام رنج و ملال مٹ جاتا ہے۔ رفتہ رفتہ ایک عجیب اور لطیف سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور پُر سکون حظ محسوس ہونے لگتا ہے۔ وہ اکثر یہ حظ محسوس کرتے ہی ادھر چلا آتا ہے اور دیر تک بیٹھا خاموش وسعتوں میں جھانکتا رہتا ہے۔

× × × × × × × ×

آج جب وہ ادھر آ رہا تھا۔ تو راستے میں ایک ناخوشگوار واقعہ دیکھنے میں آیا۔ چاوڑی بازار کی نکڑ پر ایک پولیس والا کسی آدمی کو تابڑ توڑ پیٹ رہا تھا اور دنیا بھر کی غلیظ گالیاں بکتے ہوئے دہاڑ رہا تھا۔ حرامزادہ کہتا ہے کہ مجھے مت بلاؤ۔ میں رام کا نام جپ رہا ہوں۔ ساری بگلا بھگتی نکال دونگا۔ اُدھر چوریاں کرتا ہے۔ ڈاکے ڈالتا ہے اور ادھر بیٹھا مالا جپتا ہے۔ بھیگی بلی بنا ہوا ہے۔ دیکھ (اس نے کرتا اٹھا کر بیٹی دکھائی) میں خفیہ پولیس میں انسپکٹر ہوں اور دو مہینے سے تیری تلاش میں ہوں"۔
خفیہ پولیس کا وہ افسر اس شخص کو بے تحاشا پیٹتا اور گالیاں دیتا رہا۔ دیکھتے دیکھتے ہنگامہ مچ گیا۔ سارے بازار میں سنسنی پھیل گئی بہت سے لوگ جمع ہو گئے۔ وہ اس شخص کو پٹتے دیکھتے رہے۔ پولیس افسر کی گالیاں سنتے رہے۔ کیسی کے منہ سے ایک لفظ تک نہیں نکلا۔ کسی نے پولیس افسر کے رویے کی اس کھلی بربریت کی مذمت نہیں کی۔ مشکوک اور پُر خوف نگاہوں سے کھڑے دیکھ رہے تھے۔ ایک انسان کا سر بازار پیٹے جانا بُرا لگ رہا تھا۔ لیکن چپ تھے۔ دم سادھے دیکھ رہے تھے۔ کچھ کہہ نہیں سکتے تھے۔ پولیس سے ڈر رہے تھے۔
کوشل دل ہی دل میں کڑھ رہا تھا۔ تلملا رہا تھا۔ اور نہایت پریشانی کے عالم میں سوچ رہا تھا۔ کہ آگے بڑھ کر پولیس والے کا ہاتھ روک لے اور کہے "مانا کہ تم پولیس افسر ہو۔ لیکن تمہیں کسی شخص کو یوں پیٹنے کا کیا حق حاصل ہے؟ اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ یہ وہی شخص ہے جسے تم دو مہینے

سے تلاش کر رہے ہو؟ تمہارے کہنے بھر سے تو کوئی شخص مجرم نہیں ہو جاتا۔ مانا کہ یہ وہی شخص ہے جسے تم ڈھونڈ رہے تھے۔ تو بھی اسے گرفتار کر کے لے جاؤ۔ عدالت میں پیش کر کے اس کا جرم ثابت کرو۔ اور قانون کی رُو سے اسے سزا دلاؤ۔ جب تک جرم ثابت نہیں ہوتا۔ یہ شخص آزاد ہندوستان کا آزاد شہری ہے۔ اسے پیٹنے۔ گالیاں دینے اور بےعزت کرنے کا اختیار تمہیں کس نے دیا ہے؟ اگر یہ شخص چور، ڈاکو یا بگلا بھگت ہے۔ تو تم اس سے کہیں بڑے مجرم ہو۔ کیونکہ تم نے ایک بے گناہ انسان کو سب کے سامنے پیٹا ہے۔ ہمارے شہری حقوق کو پاؤں تلے روندا ہے۔ تم نے صرف ایک شخص کی نہیں۔ تمام انسانیت کی ——— ہندوستان کے کروڑوں عوام کی بےعزتی کی ہے!!

لیکن سب کو چپ دیکھ کر وہ بھی چپ رہا۔ مُنہ کھولنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ بولتا تو پولیس افسر اسے بھی چوروں اور ڈاکوؤں کے گروہ ہی کا ایک فرد کہہ کر سب کے سامنے پیٹتا۔ گالیاں دیتا اور پکڑ کر لے جاتا۔ کون اسے بے گناہ ثابت کرتا؟ کسی کی زبان تک نہ کھلتی۔ قانون کی بات کون سنتا ہے۔ ہر ایک کو اپنی فکر پڑی ہے۔ گویا خوف اور دہشت کا دَور دورہ ہے۔

یہ صرف ایک اور اچانک واقعہ نہیں تھا۔ ایسے واقعات ہمیشہ ہوتے رہتے تھے۔ لوگ انہیں دیکھنے اور چپ چاپ برداشت کر لینے کے عادی ہو چکے تھے۔ ظلم اور بے انصافی کو چپ چاپ سہتے رہنے سے روح میں خوف بھر جاتا ہے۔ انسانیت کا زوال ہوتا ہے اور احساس مٹ جاتا ہے۔ احساس

مٹ جائے تو انسان اور حیوان میں کوئی فرق نہیں رہ جاتا۔ اس میں تہذیب اور کلچر کا عنصر بہت کم رہ جاتا ہے۔ تہذیب اور کلچر ہی انسان کو انسان بناتا ہے۔

کوشل تھوڑی دیر پہلے اس واقعہ کو سوچ کر دکھی اور پریشان ہو رہا تھا اور اپنی بے بسی اور لاچاری پر کڑھ رہا تھا۔ جب ——— لوگوں کی بہت بڑی گنتی خوف اور دہشت میں زندگی بسر کر رہی ہو۔ انصاف اور بے انصافی کے متعلق بے اعتنائی کا رویّہ اختیار کئے ہوئے ہو۔ تو ایک حساس نوجوان اپنے ہی خیالات و جذبات سے بیزار رہتا ہے۔ اس کا احساس برعان نہ ہو کر شاپ بن جاتا ہے۔ اخلاق، انصاف اور حقوق کی بات چھوڑ کر حیوانوں کی طرح جینے کو جی چاہتا ہے۔

لیکن احساس جوتا یا قمیض تو نہیں ہے کہ انسان اسے اپنی خواہش کے مطابق اتار کر الگ رکھ دے اور جیسے چاہے رہنے لگے۔ اگر ایسا ہو سکتا تو طرح طرح کے جور، جبر اور اذیتوں کے باوجود انسانیت اور تہذیب نے جو ترقی کی ہے وہ کبھی نہ ہوتی۔ اور انسان وحشت اور بربریت کے دور سے ایک قدم بھی آگے نہ بڑھ سکتا لیکن اس نے احساس کے حسین جذبہ کو ہمیشہ خونِ دل سے سینچا ہے اور جوت سے جوت جگائی ہے اور جگاتا رہے گا۔ اگر وہ انسان ہے تو سوچ سے ——— احساس سے فرار ممکن نہیں۔

کچھ ایسی ہی بات سوچ کر کوشل نے ایک لمبی گہری سانس چھوڑی۔ طبیعت میں کچھ سکون محسوس ہوا۔ اور وہ میدان کی وسعتوں میں جھانکنے لگا۔

(۲)

گرمی کے دنوں میں جو سینکڑوں ہزاروں لوگ اس کے اِرد گِرد سوئے رہتے تھے۔ انہوں نے سردی سے بچنے کے لئے اپنی اپنی بساط کے مطابق گھروندے ڈھونڈ لئے ہیں۔ لیکن کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو اس میدان کے مستقل باشندے ہیں۔ دسمبر کے اس کڑکتے جاڑے میں بھی وہ اپنی راتیں یہیں بسر کرتے ہیں۔ ان میں سے بہتوں کے سر پر آسمان کے سوا کوئی دوسرا سایہ نہیں۔ کپڑا بھی ناکافی ہے لیکن انہیں اس میدان کی دھرتی سے پیار ہے۔ وہ اس سے چپٹ کر سوئے رہتے ہیں۔ جیسے بچہ اپنی ماں سے چپٹ کر سوتا ہے دھرتی کا جسم انہیں گرمی پہنچاتا ہے ــــــ محبت اور پیار کی گرمی۔ اس محبت سے ان کی روندی اور کچلی ہوئی روح کو تسکین ملتی ہے۔ وہ بھی دھرتی سے۔ ــــــ اس میدان سے محبت کرتے ہیں۔

یہی ایک غیر مرئی رشتہ ہے جو کوشل میں اور اس میدان کے باسیوں میں مشترک ہے۔ یہ رشتہ اسے ان کے بہت نزدیک لے آیا ہے۔ اور انہیں سمجھنے میں ممد ثابت ہوا ہے۔ ان میں سے بعض افراد نے اس رشتے کو سمجھ لیا ہے۔ وہ کوشل کے دوست بن گئے ہیں۔ جب وہ ان کے درمیان جاتا ہے تو وہ ان کی خاموش نگاہوں میں خوش آمدید پڑھ سکتا ہے۔ یہ لوگ جمال رفیق۔ بندے سائیں۔ مرشد اور مریم ہیں۔ بعض ایسے بھی ہیں جن کی وہ

شکلوں اور روحوں سے واقف ہے لیکن نام نہیں جانتا۔ اور نام جاننے کی چنداں ضرورت بھی نہیں۔ ان سب کا ایک ہی نام ہے اور وہ ہے ——— انسان!

وہ اس میدان کا مستقل باشندہ نہیں ہے۔ لیکن اکثر آتا رہتا ہے۔ ان لوگوں سے ملتا رہتا ہے۔ اور ان سے باتیں کر کے خوش ہوتا ہے اور ان سے ملنے جلنے میں کوئی وقت حائل نہیں ہے۔ یہ لوگ بہت ہی ملنسار واقع ہوئے ہیں۔ اور یہاں کوئی دروازے اور دیواریں نہیں ہیں۔ وہ جس وقت بھی چاہے ان کے پاس آ جا سکتا ہے۔ اور ان کی کسی بھی بات میں شامل ہو سکتا ہے۔ یہاں کسی مجلسی آداب کی پابندی نہیں ہے۔ کوئی راز یا بھید نہیں ہے۔ وہ اسے اپنے جھگڑوں تک میں ثالث بنا لیتے ہیں۔ اور اپنی نجی باتیں اسے یوں سناتے ہیں۔ جیسے اس کی اپنی ذات سے خاص تعلق رکھتی ہوں۔

اس دن جب وہ کلیم اللہ شاہ کے مزار کے قریب بنی ہوئی ان کی برساتی کپڑے کی جھونپڑیوں کی طرف گیا۔ تو رات کے آٹھ نو بجے ہو نگے۔ رفیق اور اس کی بیوی آپس میں لڑ جھگڑ رہے تھے۔ عورت بہت ہی اونچی اور کرخت آواز میں گویا چیخ کر کہہ رہی تھی ——— "میں تو بولوں گی۔ ہر ایک سے بولوں گی۔ یہ کون ہوتا ہے منع کرنے والا؟ اس کی گالیاں بھی سہیں اور جوتیاں بھی کھائیں!"

"استری کا تو دھرم ہی یہ ہے۔ جس طرح بھی آدمی رکھے اسی طرح رہے"۔

ایک لمبے قد کا آدمی جس نے سر پر انگوچھا باندھ رکھا تھا۔ اپنی داڑھی میں

ہاتھ پھیرتے ہوئے اسے نصیحت کر رہا تھا۔

"میں اس کے یہاں نہیں بیٹھوں گی۔ طلاق دیدے ورنہ پھنسادونگی۔ تھانے میں جاکر یہ کہونگی کہ یہ بہن کا خصم مجھے مارنے آتا ہے"۔ عورت نے ایک دم بہت سی گالیاں دے ڈالیں۔

"دیکھا گالیاں دیتی ہے۔ پھر کہو گے میں ہی برا ہوں"۔ رفیق نے فریاد کی۔

"آپس میں لڑا نہیں کرتے"۔ داڑھی والے شخص نے عورت کو سمجھانا جاری رکھا۔ "وہ گرم ہو۔ تم نرم پڑ جاؤ۔ اور تم گرم ہو تو وہ نرم ہو جائے۔ ایک دوسرے کی سہہ کر ہی نباہ ہوتا ہے۔ ورنہ جن فقیرنیوں نے اپنے مردوں کو چھوڑ دیا ہے ناگن بنی پھرتی ہیں"!

"مانگتی ہیں تو مزے سے کھاتی بھی ہیں۔ یہ چھوکری کا یار مجھے کیا کھلائے گا؟ اس کا اپنا پیٹ تو بھرتا ہی نہیں۔ سارا سارا دن پڑا لوگوں کی چغلیاں کیا کرتا ہے۔ فلاں عورت بدمعاش ہے۔ فلاں آدمی لفنگا ہے — جیسے دنیا بھر میں بس یہی ایک شریف زادہ ہے"۔

"جانتی ہی ہو۔ ہم لوگ تو فقیر ہیں۔ جو کچھ مل گیا اسی پر گذارہ کرنا پڑتا ہے۔ مانگنے جاتے ہیں۔ دیناداتا کی مرضی ہے ——— کبھی گھی گھنا۔ کبھی مٹھی بھر چنا اور کبھی اس سے بھی منع"!

"یہ تو مانگنے بھی نہیں جاتا۔ نکما پڑا.........."! عورت نے پھر گالی دی۔

"دیکھ، گالی دیتی ہے۔ میں تجھے کہتا ہوں کہ گالی مت دے۔"

"کیوں نہ دوں۔ میں تو دوں گی گالی۔ جو ہمارا دل دکھاتا ہے ہم بھی دکھائیں گے اُسے۔"

"میں نے کیسے دکھایا ہے تمہیں؟ بازار سے روٹی لا دی ہے سالن لا دیا ہے۔ کھا لو بیٹھ کر۔"

"کیسے کھا لوں؟ سالن تو آپ کھا آیا راستے میں۔"

"سنیئے ذرا میری بات اور پھر آپ ہی انصاف کیجئے۔" رفیق نے کوشل سے کہا۔

"بازار میں آج کہیں ایک آنہ کا سالن ملتا ہے۔ میں روٹی لینے گیا تھا۔ منت خوشامد کر کے ایک آنہ کا سالن بھی لے آیا۔ اس نے شوربا اور ایک ذرا سی بوٹی ڈال دی۔ میں نے لا کر اس کے سامنے رکھ دی۔ اس نے دو چار لقمے کھائے۔ پھر ایک دم سب کچھ پٹک دیا۔ اور کہا۔ اس میں تو کچھ بھی نہیں ہے۔ بوٹیاں تم خود راستے میں کھا آئے۔ آپ ہی بتایئے۔ کوئی اپنی عورت سے بھی ایسا کر سکتا ہے۔ مجھے جو کچھ ملتا ہے میں لا کر ہمیشہ اسے دیتا ہوں۔ پھر بھی لڑتی جھگڑتی رہتی ہے۔"

کوشل سوچ میں پڑ گیا۔ اس نے رفیق کی بات سے اندازہ لگایا۔ کہ جھگڑے کا یہ پہلا ہی موقعہ نہیں ہے۔ ان میں یہ چخ چخ اکثر ہوتی ہے۔ اور بیوی ایسے موقعہ پر وہ سب باتیں کہہ ڈالتی ہے۔ جو اس درمیان میں اس کے دل میں جمع ہوتی رہتی ہیں۔ اُسے کوفتیں اور تنگ کرتی رہتی ہیں۔ جب

تک وہ اپنے دل کا غبار باہر نہ نکال لے۔ اسے سکون حاصل نہیں ہوتا۔ اس وقت اسے جو کچھ کھانے کو ملا تھا۔ اس سے وہ مطمئن نہیں تھی۔ اور اس کے لئے وہ رفیق کو ذمہ وار سمجھتی تھی۔ اس لئے وہ اسے کوستی تھی۔ انصاف ایک بات پر تو منحصر نہیں ہوتا۔ بہت سی کہی ان کہی باتیں جھگڑے کی تہ میں کارفرما ہوتی ہیں۔ مہنگائی بڑھ رہی تھی۔ اس لئے بھوک بڑھ رہی تھی۔ بھوک انسان کو نیچ اور کمینہ بنا دیتی ہے۔ انصاف میں اس کا اعتقاد نہیں رہتا۔ ان لوگوں کی زندگی ہی جھگڑوں اور تلخیوں میں بسر ہوتی ہے۔ جھگڑے کے لئے کسی ایک فرد کو ذمہ وار ٹھیرانا بے کار ہے۔ اس لئے کوشل نے مختصر کہا۔

"انہوں نے ٹھیک ہی کہا ہے۔ اس وقت وہ گرم ہے۔ تم چپ رہو آپس میں لڑنا مناسب نہیں ہوتا۔"

عورت گالیاں دیتی رہی اور رفیق سنتا رہا۔ اس پر کوئی اثر نہ ہوتے دیکھ کر عورت کا غصہ اور بڑھا۔ اس نے گالیاں اور بھی تیز کر دیں۔ وہ جھنجھلاہٹ سے گویا پاگل ہو گئی تھی۔

رفیق چپ چاپ جھونپڑی میں جا بیٹھا۔ جھونپڑی اتنی تنگ تھی کہ سونا تو کیا اس میں دو آدمی کھل کر بیٹھ بھی نہیں سکتے تھے۔ مگر میاں بیوی اسی میں گذر بسر کر رہے تھے۔ دونوں پتلے دبلے اور نحیف تھے۔

(۳)

ڈاڑھی والا شخص جس نے انگوچھا باندھ رکھا تھا کوشل کے نزدیک آ گیا۔ اس نے ہاتھ بغلوں میں دبا رکھے تھے۔ اور باہیں قینچی کی شکل میں چھاتی پر رکھی ہوئی تھیں۔ اس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔ جھگڑا نپٹانے کے لئے کوشل کو اپنی بات دوہراتے سن کر وہ دل ہی دل میں خوش ہوا۔ یہ مسکراہٹ اس خوشی کی مظہر تھی۔ آدمی جسے اپنی بات کا احترام کرتے دیکھتا ہے۔ جھٹ اس سے مانوس ہو جاتا ہے۔ اس ناطے سے وہ کوشل سے اپنا تعارف کراتے ہوئے بولا ــــــــ

"میں نے چودہ سال فقیری کی ہے اور کھونٹ کھونٹ گھوما ہوں۔ فقیروں کو خوب دیکھا ہے۔ ان سب کو ایسے چھان مارا ہے جیسے عورت آٹا چھانا کرتی ہے۔ مگر مجھے کسی میں فقیری نظر نہیں آئی۔"

اس شخص سے کوشل کی یہ پہلی ملاقات تھی۔ اس لئے اسے سر سے پاؤں تک دیکھا۔ قد لمبا اور جسم گٹھا ہوا تھا۔ میدان کے دوسرے باسیوں کی بہ نسبت اس کے کپڑے صاف ستھرے۔ قیمتی اور ثابت تھے اور اس نے سویٹر بھی پہن رکھا تھا۔ چہرہ کھلا ہوا تھا۔ آنکھوں میں خود اعتمادی کا جذبہ تھا اور بات کرتے ہوئے فخریہ انداز سے مسکرا رہا تھا۔ کوشل کو اس کی ذات سے کچھ دلچسپی پیدا ہوئی۔ اور اس نے دریافت کیا۔

"آپ بھی کیا یہیں رہتے ہیں؟"

"جی ہاں! میں بھی یہیں رہتا ہوں" - وہ بولا - اور ہاتھ کے اشارے سے کوشل کا دھیان بائیں طرف دلاتے ہوئے کہا - "دیکھئے وہ چارپائی میری ہے"۔

سرس تلے ایک چھوٹی سی جھونپڑی تھی - اور اس میں چارپائی بچھی ہوئی تھی - دوسرے فقیروں کو ٹاٹ بھی میسّر نہیں تھے - اس لئے اپنی چارپائی کا ذکر اس نے خاص فخر سے کیا تھا۔

"پہلے کبھی نظر نہیں آئے"، کوشل بولا۔

"مَیں سڑک کے اس طرف درگاہ کی نوکری کرتا ہوں - بارہ سال تک یہیں کلیم اللہ شاہ کی نوکری کرتا رہا ہوں - پھر پیر صاحب کسی بات پر مجھ سے ناراض ہو گئے - اور مجھے اُدھر الف شاہ کی درگاہ پر بھیج دیا - مَیں چلا گیا - سو وہ درگاہ وہاں قلعے کے نیچے ہے - میں نے کئی بار آپ کو اُدھر سے گذرتے دیکھا ہے - میں ایک سال تک نوکری کرتا اور اسی جگہ رہتا رہا - آخر ایک دن پیر صاحب خوش ہو گئے اور مجھے پھر یہاں بُلا لیا"۔

"اچھا! پیر صاحب نے تمہیں خود بلایا؟" کوشل نے حیرت کا اظہار کیا۔

"جی ہاں - پیر صاحب مجھے خواب میں نظر آئے اور کہا کہ اب تمہاری سزا پوری ہو گئی ہے - اور تم ادھر آ سکتے ہو"۔

کوشل نے معنی خیز نگاہ سے اس کی طرف دیکھا - وہ سنجیدہ اور گمبھیر تھا - جب آدمی سنجیدہ اور گمبھیر ہو - تو اس کی شخصیت گھیرے میں لپٹے ہوئے

ماحول کی مانند پُراسرار بنی رہتی ہے۔ متجسس نگاہیں اس میں جھانکنے۔ اس کی تہ تک پہنچنے میں قاصر رہتی ہیں۔ اس شخص کے چہرے سے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ آپ بیتی سنا رہا ہو۔ جیسے اس میں جھوٹ اور تصنّع کا شائبہ تک نہ ہو۔ کوشل نے بھی کسی طرح کے شک کا اظہار نہیں کیا۔ نہایت سادگی سے دریافت کیا۔

"وہ بات کیا تھی جس پر پیر صاحب ناراض ہو گئے تھے؟"

"بات یوں تھی"۔ اس نے بغل میں سے دایاں ہاتھ نکال کر درگاہ کے پیچھے کی طرف اشارہ کیا۔ "پہلے یہاں کیلے کے پیڑ تھے۔ بہت گھنے۔ ان میں چھپ کر جانے کیا کیا ہوتا تھا۔ اب بھی بہت کچھ ہوتا ہے۔ یہ سب کہنے کو تو فقیر ہیں۔ لیکن عام لوگوں سے بھی گئے گزرے ہیں۔ سارا سارا دن جوا کھیلتے ہیں۔ دُنیا میں کون سا عیب ایسا ہوگا جو وہ نہیں کرتے۔ سرکار کو پتہ چل جائے۔ تو کسی کو یہاں نہ رہنے دے۔ ایک ایک کو جیل میں ڈال دے میں سب دیکھتا ہوں اور اپنا مست رہتا ہوں۔ کسی سے کچھ نہیں کہتا۔ پیر مرشد ہمارے گناہ اپنی پناہ میں لے"۔ اس نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔ اور پھر اُوپر کو ہاتھ اٹھا کر عربی کے کچھ الفاظ گُن گُنائے۔ جیسے اللہ تعالےٰ سے دُعا مانگ رہا ہو۔ اس کے بعد آگے کہا۔ "مجھ سے جو سلوک بن پڑتا ہے کر دیتا ہوں۔ یہ میرا ہی دم ہے کہ گھومتا پھرتا کوئی فقیر ادھر آ نکلے اُسے مَیں اپنا مہمان سمجھتا ہوں۔ بساط بھر خدمت کرتا ہوں۔ کبھی کسی کو بھوکا نہیں سونے دیا......"

"آپ وہ بات سنا رہے تھے جس سے پیر صاحب ناراض ہوئے تھے"۔ کوشل نے اسے ٹوکا۔

"ہاں۔ ان کیلوں میں چھپ کر بہت سے گناہ ہوتے تھے۔ میں سب کچھ دیکھتا تھا۔ اور چپ رہتا تھا۔ پیر صاحب خود جانیں۔ ہمیں کیا مطلب! لیکن ایک دن دریا گنج کے علاقے کا تھانیدار کسی عورت کو ساتھ لے کر آیا۔ اور کیلوں کے ان پیڑوں میں جا گھسا۔ میں بھی ان کے پیچھے پیچھے گیا۔ ایک کپڑا بچھا کر عورت زمین پر لیٹ گئی۔ اور تھانے دار اس پر جھکا۔ میں نے جاتے ہی اس کی کمر پر اتنے زور کی لات لگائی کہ وہ منہ کے بل دھرتی پر جا گرا۔ پھر اٹھ کر جو بھاگا۔ تو پیچھے مڑ کر بھی نہیں دیکھا۔"

وہ دور اندھیرے میں جھانکنے لگا۔ جیسے تھانے دار کو بھاگتے ہوئے دیکھ رہا ہو۔ اس کے ہونٹوں پر پھر مسکراہٹ کھیل رہی تھی اور وہ اپنی جوانمردی پر خوش ہو رہا تھا۔

"لیکن اس کے بعد جب میں جا کر سویا"۔ ایک منٹ چپ رہنے کے بعد وہ پھر بولا "تو پیر صاحب دکھائی دئے۔ وہ بہت ناراض تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ تھانیدار ہماری پناہ میں آیا تھا۔ جب ہم خود سب کو دیکھتے ہیں تو تم اسے سزا دینے والے کون ہوتے ہو؟ اٹھو! ابھی یہاں سے چلے جاؤ۔ اور دوسری طرف جا کر رہو۔ جب تک ہم دوبارہ نہ بلائیں! ادھر مت آنا۔ تم نے گناہ تو بہت بڑا کیا ہے۔ لیکن تمہاری خدمات کے عوض تمہیں معاف کر دیتے ہیں۔"

"اس کا مطلب ہے کہ پیر صاحب سب کچھ جانتے ہیں؟"

"جی ہاں سب کچھ جانتے ہیں اور بہت کرامات والے ہیں۔ آپ شاہجہان بادشاہ کے پیر تھے۔ بادشاہ سلامت کوئی بھی کام شروع کرنے سے پہلے پیر صاحب سے دُعا حاصل کرتے تھے۔ حکومت کا کوئی بھی کام پیر صاحب کے مشورے کے بغیر نہیں ہوتا تھا۔"

"اچھا۔ آپ شاہجہان بادشاہ کے پیر تھے؟"

"جی ہاں۔ شاہجہان کے پیر تھے۔" اس شخص نے کامل خود اعتمادی سے کہا اور جامع مسجد کی طرف دیکھنے لگا۔ جیسے اس کی بات اتنی ہی بڑی تاریخی صداقت ہو جتنی کہ جامع مسجد۔

"لیکن شاہ جہان نے اپنی بیگم کی قبر پر تو تاج محل بنوایا اور پیر کا مزار اس قدر معمولی رہنے دیا۔" کوشل بولا۔

"نہیں صاحب! تاج محل شاہجہان نے نہیں بنوایا"۔ اس شخص نے تردید کی۔

"ہم نے کتابوں میں تو یہی پڑھا ہے کہ تاج محل شاہ جہان نے بنوایا ہے اور اس کی وجہ یہ تھی۔ کہ اسے اپنی ملکہ سے محبّت تھی۔"

"کتاب کی بات چھوڑیئے۔" وہ یوں مسکرایا جیسے کوشل نے کوئی نہایت بے وقوفی کی بات کہہ دی ہو۔ "مَیں آپ کو حقیقت بتاتا ہوں۔ ہم لوگ ہیں تو ان پڑھ۔ لیکن اللہ کے فضل سے ایسی ایسی باتیں جانتے ہیں جو کتابیں پڑھنے والوں کو قیامت تک معلوم نہیں ہو سکتیں۔ اور پھر انگریزوں نے

تو ہماری کتابوں میں اس قدر جھوٹ ملا دیا ہے۔ جس کی کوئی حد نہیں۔"
وہ ڈاڑھی کھجلاتے ہوئے ایک بار پھر مسکرایا۔ کلیم اللہ شاہ کے مزار پر بجلی کی جو بتی جل رہی تھی۔ اس کی روشنی ان پر پڑ رہی تھی۔ اور کوشل اس کی تبسمی دیکھ سکتا تھا۔ اس کی آنکھوں میں خود اعتمادی اور افتخار کا جذبہ اُبھر آیا تھا۔ ہاتھ اس نے بدستور بغلوں میں دبا رکھے تھے۔ پھولتی ہوئی چھاتی پر بازو ذرا اور کس لئے تھے۔ اس نے بایاں پاؤں اٹھا کر دائیں طرف رکھ لیا جس سے بایاں گھٹنا دائیں گھٹنے کے اوپر آ گیا۔ اور یوں جسم کا تمام بوجھ تک بھگ ایک ٹانگ پر ڈال کر اس نے کہنا شروع کیا:۔

"تاج محل جہانگیر بادشاہ نے اپنی ملکہ نور جہاں کی ماں کے لئے بنوایا تھا۔ نور جہاں ایک خادمہ کی بیٹی تھی۔ اس نے جہانگیر سے کہا کہ میری والدہ کی رہائش کے لئے ایک ایسا محل بنوائیے کہ فردوس کا نقشہ زمین پر اتر آئے۔ اور ملکہ کی فرمائش پوری کرنے کے لئے جہانگیر بادشاہ نے یہ تاج محل بنوایا تھا۔"

"تم نے آج ایک نئی بات بتائی۔ کسی کتاب میں یہ نہیں لکھا۔ کہ تاج محل زمین پر فردوس کا نقشہ ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ تم واقعی بہت کچھ جانتے ہو۔"

کوشل سے اپنی تعریف سن کر حوصلہ بڑھا اور وہ ایک بچے کی طرح مسرت سے کھل اٹھا۔ بولا:۔

"میں آپ کو یہ بھی بتا سکتا ہوں کہ بادشاہ نے جنّت کیسے دیکھی اور اس کا نقشہ کیسے اتارا۔ یہ بھی ایک دلچسپ داستان ہے کہئیے۔ تو سناؤں"۔

"ہاں ہاں۔ ضرور سناؤ!" کوشل نے اسے بڑھاوا دیا۔

اس نے بائیں ٹانگ دائیں ٹانگ سے اتار کر پہلو بدلا۔ اور سیدھے کھڑے ہو کر جہانگیر کے جنّت دیکھنے کا قصہ یوں بیان کرنا شروع کیا:

"بادشاہ کا ایک سپاہی تھا۔ رمضانی۔ وہ پانچوں وقت نماز گزارتا تھا۔ قرآن شریف کی تلاوت کرتا تھا۔ اور ہر گھڑی اللہ سے لو لگائے رہتا تھا۔ ایک دن کی بات ہے۔ بادشاہ سلامت محل میں وارد ہونے کے لئے آئے۔ ڈیوڑھی پر رمضانی کا پہرہ تھا۔ وہ اپنے ہی دھیان میں مست تھا۔ اس لئے حضور کو نہیں دیکھا۔ جب بادشاہ سلامت بہت قریب آ گئے۔ تب کہیں اس نے آہٹ سنی۔ اور چونک کر سلام بجا لایا۔ "کہاں گئے ہوئے تھے؟" بادشاہ نے رمضانی سے دریافت کیا۔

"کہیں نہیں حضور! یہیں حاضر تھا۔ اور حضور کی خدمت بجا رہا تھا۔"

"نہیں۔ تم تو کوئی اور ہی خدمت بجا رہے تھے۔ سچ کہو ہم تمہیں کچھ نہیں کہیں گے۔"

رمضانی نے سچ سچ بتایا۔ کہ وہ اللہ تعالےٰ کے حضور میں حاضر تھا۔ اور جنّت کا منظر دیکھ رہا تھا۔

"تو کیا ہمیں بھی جنّت دکھا سکتے ہو؟"

"اگر حضور خواہش رکھتے ہوں۔ تو کچھ مشکل نہیں۔ حضور کو بھی دکھائی

جا سکتی ہے "

"کیوں نہیں - ہمیں اور ہماری بیگم کو جنّت دکھاؤ۔"

سپاہی کو حکم ملنے کی دیر تھی - پہلے تو اس نے بے ادبی کے لئے معذرت چاہی، اور پھر ایک بغل میں بادشاہ اور دوسری میں بیگم کو دبایا اور انہیں جنّت میں لے گیا۔

تاج محل کے بارے میں یہ قصّہ پریوں کی کہانی کی طرح دلچسپ تھا۔ اور سنانے کے ڈھنگ سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس کی سچائی میں اس طرح یقین رکھتا ہے جس طرح بچے پریوں کی کہانی کو سچ مان لیتے ہیں - اس نے جب یہ قِصّہ کسی بوڑھے فقیر یا اولیائی زبانی سنا تھا۔ تو اسے اس کی صداقت پر ذرا بھی شک نہیں گذرا تھا۔ اس کے بعد وہ خود اسے سینکڑوں بار دوسروں کو سنا چکا تھا - اور کسی نے بھی اس کی صداقت پر شک کا اظہار نہیں کیا تھا۔ اب یہ قصہ اس کی زندگی کا لازمی جزو بن چکا تھا - اس کی روح میں سما چکا تھا۔ کوشل اگر اسے اپنی تاریخی علمیت کی بنا پر جھٹلانے کی کوشش کرتا تو اسے ہرگز کامیابی نصیب نہ ہوتی - وہ صرف سننے والے کے جذبات کو مجروح کرتا - اس لئے وہ بنا کچھ بولے چپ چاپ سنتا رہا۔ جیسے سنانے والے کی طرح وہ بھی اسے سچ مانتا ہو - برابر سننے سنانے اور دوہرائے جانے سے بہت سے جھوٹ انسان کی زندگی کا جزو بن جاتے ہیں - اور رفتہ رفتہ ایک ایسی ازلی صداقت کا درجہ حاصل کر لیتے ہیں - کہ لوگ ان کے بارے میں سوچنا ہی چھوڑ دیتے ہیں - ان کے متعلق کسی

قسم کے شک اور اعتراض کو گوارا نہیں کرتے۔ علم اور سائنس اسے باطل عقیدہ، واہمہ اور قدامت پسندی ثابت کرتی رہے۔ لیکن ماننے والے اسے سرمایۂ حیات تصوّر کرتے ہیں۔ اور تازندگی سینے سے لگائے رہتے ہیں اور بعض لوگوں کے یہ عقائد اتنے معصوم اور بے ضرر ہوتے ہیں کہ ان پر یکایک اعتراض کر دینا مناسب بھی نہیں ہوتا۔ کیونکہ یہ عقیدے ان کی تاریک زندگی میں جگنوؤں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور اُسے اجالا بخشتے ہیں۔

کوشل چپ چاپ سنتا رہا۔ اور وہ شخص اپنی نظر میں آپ اونچا اٹھتا رہا۔ جب وہ جسم کو اوپر کھینچ رہا تھا۔ تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ ایڑیاں اٹھا کر پنجوں کے بل کھڑا ہو گیا ہے اور یوں اس کا قد کچھ بڑھ گیا ہے۔ اس قصّے کی عظمت اس کی اپنی عظمت کا ثبوت تھی۔ جوں جوں قصّہ آگے بڑھتا رہا۔ اس کا جسم بھی بڑھتا اور پھیلتا گیا۔

اس نے زندگی میں شاید پہلی مرتبہ ایک پڑھے لکھے آدمی کے سامنے اپنے علم کی نمائش کی تھی۔ اور اسے عقیدت اور احترام سے سنتے دیکھ کر اس قدر خوش ہوا کہ دو تین قصّے اور سنا ڈالے۔ جو اکبر، جہانگیر اور شاہجہان وغیرہ مغل بادشاہوں اور اس زمانے کے پیروں اور فقیروں کے متعلق تھے۔ جس سے ظاہر تھا کہ اس وقت کی سماجی زندگی میں پیروں فقیروں کو بھی اتنی ہی اہمیت حاصل تھی جتنی کہ بادشاہوں کو۔ اور سنانے والے کے انداز اور ذہنی کیفیت سے ظاہر تھا کہ اس کی روح اب بھی اس دور میں بھٹک

رہی ہے یعنی وہ اپنے تخیل میں مست اب بھی اسی دور میں زندگی بسر کر رہا ہے۔ اس کے بعد تین ساڑھے تین صدی کا جو اتنا لمبا اور سماجی اور سیاسی تبدیلیوں سے بھرپور زمانہ گزر گیا ہے وہ اس کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔

رات کافی گذر گئی تھی اور سردی بہت بڑھ گئی تھی۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکے جسم کو چیرتے ہوئے نکل جاتے تھے۔ سب لوگ اپنی اپنی جھونپڑیوں یا پھٹے پرانے اوڑھنوں میں دبک گئے تھے۔ ڈاڑھی والا وہ شخص اس حقیقت سے بے نیاز اپنی بات سنائے جا رہا تھا۔ ایک کے بعد دوسرا قصہ جھٹ شروع ہو جاتا تھا۔ وہ قصے الف لیلیٰ کی کہانیوں کی طرح کبھی ختم نہ ہونے والے معلوم ہوتے تھے۔ اور وہ ان سب کو ایک دم سنا دینے کے لئے بے تاب تھا۔ لیکن کوشل اب جانا چاہتا تھا۔

"اچھا آج سے ہم تم دوست ہوئے"۔ کوشل نے مصافحہ کے لئے ہاتھ آگے بڑھایا۔ جو اس شخص نے بغل سے نکلے ہوئے اپنے گرم ہاتھ میں تھام لیا۔ "میں تم سے گلے ہے گا ہے ملتا رہونگا۔ تمہارا نام کیا ہے؟ اور تمہیں کیسے ڈھونڈا جائے؟"

"نام تو میرا ابراہیم ہے۔ لیکن سب لال پگڑی والا کہتے ہیں۔ یہ دیکھو میرے سر پہ لال پگڑی ہے۔ میں متولّی ہوں۔ یہ پگڑی بارہ سال کی خدمت کے بعد ملتی ہے۔ ہر ایک شخص اسے نہیں پہن سکتا۔ تم یہاں آ کر کسی سے بھی پوچھ لینا کہ مجھے لال پگڑی والے سے ملنا ہے!"

ابراہیم کی آنکھوں میں جذبۂ افتخار چمک رہا تھا۔ زندگی جھلک رہی تھی۔ جذبۂ افتخار مر جائے۔ تو آدمی مر جاتا ہے۔ زندگی کو برقرار رکھنے کے لئے آدمی ہر حالت میں اس جذبے کی حفاظت کرتا ہے۔

(۴)

دوسرے دن کوشل کی چھٹی تھی۔ وہ گیارہ بجے گھومتا گھامتا پریڈ گراؤنڈ میں آنکلا۔ ابراہیم بیٹھا کھانا کھا رہا تھا۔ وہ اکیلا نہیں تھا۔ اس کے ساتھ ایک، ادھیڑ عمر کی عورت اور ایک مرد بھی بیٹھا تھا۔ وہ تینوں اکٹھے کھانا کھا رہے تھے۔ مرد کا جسم بھاری تھا۔ اور چہرے پر حنائی رنگ کی ڈاڑھی تھی۔ جو ابراہیم کی ڈاڑھی کے مقابلہ میں زیادہ لمبی اور گھنی تھی۔ عورت دُبلی پتلی اور صحت مند تھی۔ اس نے ٹھوڑی اور گال گُھنوا رکھے تھے۔ ہاتھوں اور پاؤں میں گلٹ کے چند زیور تھے۔ اور ہونٹ اور دانت پان چباتے چباتے سیاہ پڑ گئے تھے۔ "آئیے بابو جی! کھانا کھائیے"۔ ابراہیم نے کوشل کو دیکھتے ہی پہچان لیا۔

وہ دُھوپ میں بیٹھے تھے۔ زمین ڈھلوان تھی۔ اس ڈھلوان کے بعد جو زمین تھی وہ میدان کا حصہ کم اور سڑک کا زیادہ تھی۔ وہاں سے پیدل چلنے والے راہگیر ہر وقت گذرتے رہتے تھے۔ اور پرے سڑک پر موٹروں۔ تانگوں اور بسوں کا تانتا لگا رہتا تھا۔ ادھر ڈھلوان بھی میدان

کے یہ باسی دُھوپ سینکا کرتے تھے۔

کوشل ابراہیم کے قریب بیٹھ گیا اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ کلیم اللہ کے مزار سے ذرا ادھر ہٹ کر کچھ قبریں تھیں۔ ان کے اِرد گرد ان فقیروں کی جھونپڑیاں تھیں۔ قبریں اور جھونپڑیاں بہت پرانی اور بوسیدہ معلوم ہوتی تھیں۔ دونوں گرد سے اٹی ہوئی تھیں۔ قبروں میں مُدت ہوئی۔ مُردے دفنائے گئے تھے۔ اور جھونپڑوں میں زندہ انسانوں نے اپنے آپ کو دبا رکھا تھا۔ قبروں کے باسی گہری نیند سو رہے تھے۔ زندگی کے جھنجٹوں سے چھوٹ گئے تھے۔ لیکن جھونپڑیوں کے باسی فی الحال زندہ تھے۔ دُھوپ سینکنے باہر نکل آئے تھے۔ کچھ بیٹھے تھے۔ کچھ لیٹے ہوتے تھے۔ اور کچھ گپّیں ہانک رہے تھے۔ وہ سردی گرمی اور بھوک پیاس محسوس کر سکتے تھے۔ اور اپنی بدحالی کو گپّوں میں بُھلا سکتے تھے۔ یہی ان کے زندہ ہونے کی دلیل تھی۔ رفیق کی عورت جورات کو سالن کے لئے جھگڑ رہی تھی اُونچے اونچے بول کر اور گالیاں دے کر اپنے دل کی بھڑاس نکال رہی تھی۔ اور شاید یوں اپنے آپ کو اپنے زندہ ہونے کا یقین دلا رہی تھی۔ اب ایک طرف بیٹھی جوئیں مار رہی تھی۔ اس کا رنگ کالا۔ ماتھا تنگ اور شکل بندریا سے ملتی جلتی تھی۔ اب اسے چُپ بیٹھے دیکھ کر پتہ لگتا تھا کہ گویا بولنا جانتی ہی نہیں۔ کوشل ایک دو منٹ تک اس کی طرف جھانکتا رہا۔ اس کی آنکھوں میں ایک جستجو تھی۔ کسی چیز کی تلاش تھی۔ نہ جانے اس بدنما عورت میں وہ کیا ڈھونڈ رہا تھا۔ اس نے بھی کوشل کو اپنی طرف جھانکتے دیکھ لیا تھا۔

وہ آزار بند کھوے نیفے میں سے جوئیں دیکھ رہی تھی۔ دیکھتی رہی۔ کسی کی نگاہیں اس پر پڑ رہی ہیں۔ اس بات کی اسے ذرا بھی پروا نہیں تھی۔

"رات کے جھگڑے کا فیصلہ ہو گیا؟" کوشل نے ابراہیم سے دریافت کیا۔

"یہاں جھگڑے اور فیصلے ساتھ ساتھ چلتے ہیں!" ابراہیم نے مُنہ میں لقمہ ڈالتے ہوئے کہا۔

دائیں طرف سرس کا تناور درخت تھا۔ اس کے نیچے جو جھونپڑی بنی ہوئی تھی۔ وہ کافی بڑی تھی۔ اور اس میں چھ سات افراد کا کنبہ رہتا تھا۔

"یہ کس کی ہے"؟ کوشل نے جھونپڑی کی طرف اشارہ کیا۔

"یہ چارپائی صاحب؟ یہ چارپائی میری ہے۔ اس پر میں سوتا ہُوں"۔ ابراہیم نے بڑے چاؤ سے جواب دیا۔ اس کے لہجے میں وہی رات والا جذبۂ افتخار جھلک رہا تھا۔ وہ بھول گیا تھا۔ کہ وہ اس چارپائی کے متعلق پہلے ہی کوشل کو بتا چکا ہے۔

چارپائی کے پاؤں سے لاٹھیاں باندھ کر ان پر ایک برساتی باندھ دی گئی تھی۔ اس طرح ابراہیم کی مختصر جھونپڑی بنی ہوئی تھی۔ اور وہ بڑی جھونپڑی کے سامنے یوں معلوم ہوتی تھی۔ جیسے طویلے کے سامنے مرغیوں کا ڈربہ بنا ہُوا ہو۔

"ہاں۔ یہ چارپائی تو تمہاری ہے۔ میں اس بڑی جھونپڑی کے بارے میں پُوچھ رہا ہوں"۔ کوشل نے کہا۔

"وہ سائیں مبارک علی کی ہے۔ اس میں وہ اور ان کے بچے رہتے ہیں۔" ابراہیم نے دروازے کے آگے دھوپ میں بیٹھے ہوئے آدمی کی طرف اشارہ کیا۔

"یہ سب مانگ کر کھاتے ہیں؟"

"نہیں محنت مزدوری بھی کرتے ہیں۔"

اس سلسلے میں کوشل مزید واقفیت حاصل کرنا چاہتا تھا۔ لیکن اسی بیچ میں اس کے داہنی طرف گورے رنگ کا ایک نوجوان آکر بیٹھ گیا۔ اس نے سیاہ رنگ کا کوٹ اور سر پر آسمانی رنگ کی ٹوپی پہن رکھی تھی۔ جو کسی قدر قیمتی جان پڑتی تھی۔ اس نے بیٹھتے ہی جیب سے بیڑیوں کا ایک بنڈل نکالا۔ اور ایک بیڑی کوشل کو بھی پیش کی۔

"مہربانی! میں تو پیا نہیں کرتا۔" کوشل نے جواب دیا۔

"سگرٹ پیتے ہو تو سگرٹ لادوں" ہم اس نے نہایت حلیمی سے دریافت کیا۔

"نہیں۔ میں تو تمباکو پیتا ہی نہیں۔"

کوشل کے انکار کرنے پر اس نے خود بیڑی سلگائی اور پینے لگا۔ وہ بائیس تیئیس سال کا نوجوان تھا۔ دیکھنے میں بہت ہی معصوم اور بھولا بھالا معلوم ہوتا تھا اس کا رنگ چٹا اور آنکھیں چھوٹی چھوٹی تھیں۔

"تم بھی کیا یہیں رہتے ہو؟" کوشل نے دریافت کیا۔

جواب میں اس نے بتایا کہ وہ غازی آباد کے نزدیک یو۔ پی کے

ایک گاؤں میں رہتا ہے۔ وہاں اس کے گھر والے کھیتی باڑی کرتے ہیں۔ دہلی میں چار پانچ روز کے لئے گھومنے آیا ہے۔ اور یہاں عارضی طور پر ٹھہرا ہوا ہے۔

"تو یہیں کیوں ٹھہرے۔ کوئی اور جگہ نہیں تھی؟"

"ہم بھی فقیر ہیں۔ یہ لوگ بھی فقیر ہیں۔ اپنی ہی برادری کے لوگ ہیں۔ جان پہچان ہے۔ اس لئے جب کبھی دہلی آتا ہوں یہیں رہتا ہوں۔"

کوشل چپ چاپ اس نوجوان کی طرف دیکھنے لگا اور اس کی اور ان لوگوں کی حالت پر غور کرنے لگا۔

برادری کے رشتے مجسّم ہو کر اس کے سامنے آ کھڑے ہوتے۔ صدیاں گذر جانے پر بھی وہ اتنے گہرے اور مضبوط تھے کہ آدمی کے خود ٹوٹ جانے پر بھی نہیں ٹوٹتے تھے۔

"ہی۔ ہی۔ تم کھاؤ۔ بیٹی کے بابا۔ میں نہیں کھاؤنگی!"

ابراہیم کے ساتھ جو عورت کھانا کھا رہی تھی۔ وہ یکایک تیز اور ترش آواز میں چیخ اٹھی۔ اور اپنے ہاتھ کا لقمہ پھینک کر پیچھے کو ہٹ گئی۔

"کیا بات ہے"؟ کوشل نے دریافت کیا۔

"یہ گوشت نہیں کھاتیں اور بڑے میاں نے سبزی میں شوربا ملا دیا ہے!" ابراہیم نے جواب دیا۔

"لو۔ یہ تمہاری سبزی الگ پڑی ہے۔ تم اس کے ساتھ کھاؤ۔" بڑے میاں نے اطمینان کے ساتھ کہا اور عورت پھر کھانے میں

شریک ہو گئی۔ قریب ہی ایک ڈول پانی سے بھرا پڑا تھا۔ تینوں ہی اس میں سے ایک ٹین کے ڈبے کے ساتھ ضرورت کے مطابق پانی پی رہے تھے۔

"کیا کہا انہوں نے؟"

"کھانا مانگتی ہیں"۔

"آؤ۔ بڑی خوشی سے کھاؤ۔ ہم تو ایسے آدمی کو اپنے ساتھ کھلانے کی تمنا رکھتے ہیں"۔

تھوڑی دُور پنجابی فقیروں کا ایک کُنبہ ڈیرا ڈالے ہوا تھا۔ جو دو مردوں، دو عورتوں، ایک لڑکی، دو لڑکے اور ایک دودھ پیتے بچے پر مشتمل تھا۔ عورتوں میں سے ایک کی عمر ڈھل گئی تھی۔ دوسری جوان تھی۔ لیکن دونوں کافی حسین تھیں۔ یہ لوگ بھی کسی دوسرے شہر میں رہتے تھے۔ کاروبار کرتے تھے۔ اس میدان میں کچھ دنوں کے لئے مہمان آئے تھے۔ اس وقت جوان عورت بڑی عورت سے کھانا مانگ رہی تھی۔ ابراہیم کی آنکھیں اور کان جیسے تمام وقت اسی طرف لگے رہے ہوں۔ اور وہ چپکے چپکے جوان عورت کے حسین جسم پر آنکھیں گاڑ کر رُوح کو آسودہ کرتا رہا ہو۔ اور اس کی حرکات و سکنات سے لطف اندوز ہوتا رہا ہو۔ ذرا موقعہ ملا۔ تو جھٹ بول اٹھا اور اوپر کی بات کہی۔

قبروں کے قریب جو جھونپڑیاں تھیں۔ اس طرف ایک لمبا۔ موٹا اور

اور مضبوط آدمی پانی کے ڈول بھر بھر کر جھونپڑیوں کے آگے ڈھلوان پر چھڑک رہا تھا۔ تاکہ ریت اڑکر اندر نہ آئے۔ کلیم اللہ کے مزار کے قریب ایک نل لگا ہوا تھا۔ وہ پانی وہیں سے لا رہا تھا۔ اور ڈول پھینکتے وقت زور سے چلاتا تھا ——— "ان الحق!" اور اس کی بھاری بھرکم آواز فضا میں گونج اٹھتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ وہ اپنے اس کارِ خیر سے لطف اندوز ہو رہا ہے۔ اور لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرنا چاہتا ہے لیکن کوشل کے علاوہ اور کسی شخص نے اس طرف ذرا بھی دھیان نہیں دیا۔ وجہ یہ تھی۔ کہ وہ سب لوگ اس کی آواز اور حرکات وسکنات سے اس قدر مانوس ہو چکے تھے۔ کہ اس میں اب ان کے لئے کوئی بھی کشش نہیں رہ گئی تھی۔ لیکن وہ اپنا کام مستعدی سے کئے جا رہا تھا۔ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا اِدھر سے اُدھر بھاگ رہا تھا۔ اور پانی چھڑک رہا تھا۔ جیسے وہ اپنے کام سے اس طرح لطف اندوز ہو رہا ہو۔ جس طرح ایک مست بھینسا اپنے کھُروں اور سینگوں سے زمین کھود کر خوش ہوتا ہے۔ اسے کسی کے دیکھنے نہ دیکھنے سے کوئی غرض نہیں۔ زمین کھودنا اور دھول اڑانا اس کی مستی کا تقاضا ہے۔

اس کا نام بندے سائیں تھا۔

کوشل کچھ دیر بیٹھا یہ منظر دیکھتا رہا۔ بندے سائیں کی حرکات سے محظوظ ہوتا رہا۔ جب دھوپ چبھنے لگی۔ تو اٹھ کر اِدھر اُدھر ٹہلنا شروع کیا۔

کلیم اللہ شاہ کے مزار کے قریب ہی ایک اور چھوٹی قبر تھی۔ اور بقول ابراہیم اس میں کلیم اللہ شاہ کے والد نور اللہ شاہ مدفون تھے۔ وہ بھی کرامات والے فقیر ہو گذرے تھے۔ لیکن فقیری اور قلندری میں جو مرتبہ بیٹے کو نصیب ہوا۔ وہ باپ کو نہیں ہو سکا۔ شاید اس لئے باپ کی قبر بھی مختصر تھی۔ جو لوگ کلیم اللہ شاہ کی درگاہ کا نیاز حاصل کرنے آتے تھے۔ وہ چند پھول اس پر بھی چڑھا جاتے تھے۔

وہاں اب ایک خوانچے والا بیٹھا تھا۔ اور چند نوجوان جو یونہی گھومتے گھامتے ادھر آنکلے تھے۔ اس سے مونگ پھلی خرید کر کھا رہے تھے۔ وہ دو چار منٹ کے لئے وہاں رکا مگر ان لوگوں کی باتوں میں اسے کوئی دلچسپی محسوس نہیں ہوئی۔ اس لئے وہ آگے چل پڑا اور جامن کے اس درخت کے نیچے پہنچا۔ جس کے ٹہنے پورب، پچھم، اُتر اور دکن میں پھیلے ہوئے تھے اور جس کے نیچے فقیروں کی گویا ایک دوسری بستی آباد تھی۔

(۵)

اس بستی کے مرکز میں قلندر سائیں کی دھونی تھی۔ جس میں اس وقت آگ بجھی ہوئی تھی۔ لیکن اس کے ارد گرد چار پانچ آدمی بیٹھے تھے۔ قلندر سائیں نے سر پر رومال باندھ رکھا تھا۔ جس میں اس کے لمبے بال چھپ گئے تھے۔ کانوں میں بڑی بڑی مندریں تھیں۔ گلے میں چمک دار دانوں کی تسبیح تھی۔

جس میں لال، پیلے اور نیلے مختلف رنگ تھے - اور دائیں بازو میں لوہے کے کڑے تھے - جو فقیر لوگ عام طور پر پہنے رہتے ہیں - اس وقت وہ ایک تعویذ بنانے میں مصروف تھا - اور اس کے کونوں کو ریتی سے رگڑ رہا تھا -

" کیا چاہیئے ؟" قلندر سائیں نے بنا سر اوپر اٹھائے کوشل سے فقیروں کے انداز میں پوچھا - جیسے وہ بھی کوئی نیا مرید ہو -

" کچھ نہیں - آپ کا کرتب دیکھ رہا ہوں "-

" ہمارا کرتب کیا دیکھو گے میاں ! کرتب دکھانے کے دن ہی چلے گئے "- سائیں نے کہا اور وہ تعویذ کے کونے زور زور سے ریتنے لگا -

" یہ تعویذ کس چیز کا ہے ؟" کوشل نے دریافت کیا -

" سیپ کا " قریب بیٹھے ایک شخص نے جواب دیا -

" بس اب کونے ریت کر تیار ہو جائے گا ؟"

وہاں جتنے لوگ بیٹھے تھے - سب نے کوشل کو بیک وقت حیرت انگیز نگاہوں سے دیکھا - لیکن قلندر سائیں نے بغیر نگاہ اوپر اٹھائے ہی کہا -

" نہیں - اس کے بعد اس پر کلمہ لکھیں گے اور کپڑے میں مڑھ کر سی دیں گے "-

" پھر کیا بکھیٹے گا ؟"

قلندر نے اس بار نگاہیں اوپر اٹھا کر کوشل کی طرف دیکھا - اس کے ہونٹوں پر سے مونچھیں تراشی ہوئیں اور بھویں لانبی تھیں - ایک نظر دیکھ لینے کے بعد وہ پھر اپنے کام میں مصروف ہو گیا اور بولا :-

"بچ آئیں گے"۔

"اچھا آپ تعویذ بیچتے ہیں۔ ایک تعویذ کی قیمت کیا ہے؟"

"دس آنے"

کوشل کو ان لوگوں کا دھیان آیا۔ جو یہ تعویذ خریدتے تھے۔ جو شہر کی گلیوں اور محلّوں میں بکھرے پڑے تھے۔ دن رات کام کرتے تھے۔ پھر بھی ان کی آرزوئیں۔ خواہشیں اُدھوری رہ جاتی تھیں۔ کوئی دفتر میں ترقی چاہتا تھا۔ کسی کو بچے کی اور کسی کو بیاہ کی خواہش تھی۔ بعضوں کو بھوت پریت ستاتے تھے۔ اور انہیں اندھیرے میں باہر نکلتے ڈر لگتا تھا۔ ڈر اور خوف ان کی زندگی کا لازمی جزو بن چکا تھا۔ قلندر سائیں کا تعویذ ان کے اس ڈر کو دور کرنے کا ضامن بنتا تھا۔ ان کی آرزوؤں کی تکمیل میں ممد ثابت ہوتا تھا۔ اور وہ اُسے دس آنے تو کیا اس سے بھی دوگنی تگنی قیمت میں خریدنے کو تیار رہتے تھے۔

قلندر سائیں نے نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبا رکھا تھا اور وہ بڑی مستعدی سے تعویذ کے کنارے ریت رہا تھا۔ آس پاس بیٹھے لوگ اُسے عقیدت اور احترام سے دیکھ رہے تھے۔ اس کے چہرے پر خود اعتمادی کی جھلک تھی۔ جس نے سنجیدگی سے مل کر بے اعتنائی اور خود رفتگی کی سی کیفیت پیدا کر دی تھی۔ قلندر سائیں بڑا گھاگ اور ہوشیار آدمی معلوم ہوتا تھا۔ اس نے زندگی کے تجربے سے سیکھ لیا تھا۔ کہ جو لوگ بھک منگے فقیروں کو اپنے دروازے پر سے بری طرح دھتکار دیتے ہیں۔ ان کی ضعیف الاعتقادی کو

باعزت اور منافع بخش تجارت کا ذریعہ بنایا جا سکتا ہے۔ دعاؤں سے جو کام نہیں نکلتا۔ وہ تعویذ سے نکل سکتا ہے۔

چند قدم کے فاصلہ پر میاں بیوی کا ایک جوڑا بیٹھا تھا۔ خاوند کی عمر چالیس پینتالیس برس ہو گی۔ داڑھی کے آدھے بال پک چکے تھے۔ وہ کوئی کپڑا سی رہا تھا۔ شاید یہ اس کا تہمد تھا۔ وہ سینے میں اتنا کھو گیا تھا۔ کہ گردن تک اوپر نہیں اٹھتی تھی۔ اس کے ارد گرد کیا ہو رہا ہے۔ وہ اس سے بالکل بے خبر تھا۔ عورت کا قد ٹھگنا اور عمر اٹھائیس سال ہو گی۔ جسم کو قدرے چھوٹے کا روگ تھا۔ ٹانگیں اور ہاتھ کانپتے تھے۔ ورنہ وہ بدصورت نہیں تھی۔ وہ بیٹھی کیلا چھیل رہی تھی۔ اور چھلکے کو اترتا دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ اس کی انگلیاں کسی قدر ٹیڑھی میڑھی تھیں۔ اور ہاتھ لرز رہے تھے۔ اس لئے کیلا چھیلنے میں دو تین منٹ کا وقت لگا۔ چھلکا اتر گیا۔ تو اس نے کیلے کو آنکھوں کے ذرا قریب لا کر یوں دیکھا۔ جیسے اسے نگاہوں سے چکھ کر روح میں لذت کا احساس بھر لینا چاہتی ہو۔ کچھ دیر یونہی دیکھتی رہی۔ ہونٹوں پر مسرت انگیز مسکراہٹ نمایاں ہوئی۔ جو رفتہ رفتہ تمام چہرے پر پھیل گئی۔ وہ یونہی دیکھتی اور مسکراتی رہی۔ پھر اس نے لرزتے ہوئے ہاتھوں سے کیلے کو درمیان میں سے توڑا۔ اور نصف ٹکڑا خاوند کو دینا چاہا۔ لیکن وہ نظر اوپر اٹھائے بغیر ہی بولا ——— "تم کھاؤ"۔ اسے شاید پہلے ہی اس جواب کی توقع تھی۔ کیونکہ اس نے ہاتھ خاوند کی طرف زیادہ نہیں بڑھایا تھا۔ اب اس نے بلا تامل کیلا کھانا شروع کیا۔ وہ کیلا کھا رہی تھی اور اپنے

اندر پیدا ہونے والی مسرت اور گدگدی کو چہرے سے ظاہر کر رہی تھی۔ اور یہ گدگداہٹ صرف اس کے چہرے پر ہی نہیں بلکہ ماحول میں بھی محسوس کی جا سکتی تھی۔ جیسے جھنجھنے کے اندر سے سُریلی آواز نکل نکل کر فضا میں پھیل رہی ہو۔

ہاں اس کے اندر کی مسرت اور گدگداہٹ جھنجھنے کی "جھُن جھُن" کی طرح مجسم ہو کر فضا میں پھیل رہی تھی۔ اس لئے کوشل کے ذہن نے اس عورت کے لئے فوراً ایک نام تجویز کیا۔ جھُنیا!

سُورج بالکل سر پر آ گیا۔ درخت کا سایہ ابھی ڈھلنا شروع نہیں ہُوا تھا جس جگہ کو جھُنیا اور اس کے خاوند نے اپنا مسکن بنا رکھا تھا۔ وہاں اب آدھی چھاؤں اور آدھی دُھوپ تھی۔ ٹہنیوں کا پھیلاؤ اس جگہ ختم ہو گیا تھا۔ دھوپ اور چھاؤں بدلتی اور سرکتی رہتی تھی۔ لیکن خاوند بیوی ایک مرتبہ جہاں بیٹھ گئے تھے وہیں بیٹھے تھے۔ زندگی کا تمام اثاثہ انہوں نے اپنے گرد سمیٹ رکھا تھا۔ یہ اثاثہ نہایت مختصر تھا۔ ایک کمبل ایک ٹاٹ اور ایک میلی سی دری تھی۔ جو انہوں نے اس وقت بھی نیچے بچھا رکھی تھی۔ کمبل اور رضائی ایک طرف لپیٹے پڑے تھے۔ اور سرہانے کی طرف ایک ٹرنک رکھا ہُوا تھا۔ جس کے کونے ٹوٹ چکے تھے۔ اور ڈھکن کے کنارے بوڑھے جبڑوں کی طرح قبضوں کی گرفت سے آزاد ہو کر پھیل گئے تھے۔ عورت، مرد، ٹرنک اور بستر سب میں حیرت انگیز یک رنگی پائی جاتی تھی۔

کیلا کھا کر جھُنیا کو اپنے جسم میں ایک نئی قوت محسوس ہوئی۔ اور

خون کی گردش تیز ہو گئی ۔ وہ کانپتی ہوئی انگلیوں سے دوپٹہ درست کرتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی ۔ اس کے ادھ کھلے منہ میں سے رال ٹپک رہی تھی ۔ اور ٹانگیں لڑکھڑا رہی تھیں ۔ چلتی تھی ۔ تو گھٹنے آپس میں ٹکراتے تھے ۔ اسے کہیں جانا نہیں تھا ۔ ایک دو ڈگ یونہی بے مطلب اِدھر اُدھر بھرے اور پھر اپنی جگہ پر آ بیٹھی اور اپنی ننھی ننھی مگر تیز آنکھوں سے خاوند کو دیکھنے لگی ۔ اس نے تہمد کو زمین پر پھیلا رکھا تھا ۔ اور اسے متواتر دیکھ رہا تھا ۔

——— دیکھ رہا تھا ۔ اور اس کی آنکھوں میں حسرت اور تشویش کے ملے جلے جذبات بھرے ہوئے تھے ۔ وہ تہمد کو ہار سی چکا تھا ۔ ٹانکوں کے علاوہ متعدد جگہ پیوند لگے ہوئے تھے ۔ جھنیا کو اپنی طرف متوجہ دیکھ کر بولا ——" اب اس میں جان نہیں رہ گئی ۔ دو سال سے پہن رہا ہوں "۔

مرد کا چہرہ بجھا بجھا اور اداس اداس تھا ۔ جیسے اس کی روح میں اس تہمد کی طرح بہت سے پیوند اور ٹانکے لگے ہوئے ہوں ۔ جیسے اس میں بہت کم جان باقی رہ گئی ہو ۔ لیکن عورت کے جسم میں کافی جان تھی ۔ ہاتھ لرزتے ٹانگیں لڑکھڑاتی اور منہ سے رال ٹپکتی تھی ۔ ایسا معلوم ہوتا تھا ۔ کہ سارا جسم لقوہ زدہ ہے ۔ اسے جھولا مار گیا ہے ۔ لیکن اس کی آنکھوں میں ایک ازلی مسرت کی چمک تھی ۔ جو ہمکتی ہوئی زندگی کی علامت تھی ۔ مسکراہٹ کبھی اس کے ہونٹوں سے جدا نہیں ہوتی تھی "۔ اسے پھر سی کر کیا کرو گے "؟

اس نے خاوند سے کہا اور تہمد سے بے نیاز ہو کر اپنی مسکراہٹوں میں کھو گئی ۔

(۶)

کوشل جھنیا کو جھنجھناتی اور مسکراتی چھوڑ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اور بستی کے دوسرے باسیوں کو دیکھنے لگا۔ درخت کے جنوب مغربی کونے پر ایک اور کنبہ آباد تھا ——— ایک عورت، دو مرد اور ایک لڑکا۔ ان کا سامان درخت کی جڑ میں رکھا ہوا تھا۔ اور یہیں ان کا ڈیرا تھا لیکن اب انہوں نے ذرا آگے بڑھ کر ایک دری بچھالی تھی اور اس پر بیٹھے ہوئے تھے۔ عورت نے ٹانگیں پھیلا رکھی تھیں۔ اور لڑکا اکڑوں بیٹھا تھا۔ مرد ایک ادھیڑ عمر اور دوسرا نوجوان تھا۔ نوجوان دری پر اور ادھیڑ عمر ذرا پرے دھرتی پر بیٹھا تھا۔ نوجوان نے کپڑے ذرا ستھرے پہن رکھے تھے۔ اس نے قمیض کے اوپر کوٹ بھی پہنا ہوا تھا۔ اور کوٹ پر ایک پھول ٹانکا ہوا تھا۔ سر پر انگوچھا تھا۔ اور ہاتھ میں تین چار انگوٹھیاں پہن رکھی تھیں۔ وہ سگرٹ کی خالی ڈبیوں سے کھلونے تیار کر رہا تھا۔ اس لئے بہت سی خالی ڈبیاں، رنگ برنگے کاغذ اور لئی قریب رکھی تھی۔ پانچ چھ ڈبیوں کو جوڑ کر جو کھلونا تیار ہوتا تھا۔ اس میں رنگ دار کاغذ اس انداز سے چپاں کئے جاتے تھے۔ کہ جب وہ کھلتا تھا۔ تو یک بیک بہت سے رنگ آنکھوں کے سامنے آ جاتے تھے۔ اور جب اسے دوسرے سرے سے پکڑ کر کھولا جاتا تھا۔ تو یہی رنگ ایک نئی ترتیب سے سامنے آتے تھے اور ایک مختلف اثر پیدا کرتے تھے۔ وہ دن بھر یہ کھلونے

بناتا تھا۔ اور شام کو محلوں اور گلیوں میں بیچ آتا تھا۔

"ذرا پرے۔ پرے"۔

کوشل کو اپنی طرف بڑھا آتے دیکھ کر کھلونے بنانے والے نوجوان نے کہا۔ جیسے وہ اس کے سامنے پڑے ہوئے کاغذ ملی پر چڑھ آئے گا اور انہیں روند ڈالے گا۔

"گھبراؤ مت" کوشل نے ملائمت سے کہا۔ "کوئی چیز خراب نہیں کرونگا میں صرف آپ لوگوں کو دیکھنا چاہتا ہوں"۔

عورت اُفق پر آنکھیں جمائے بیٹھی تھی۔ اب اس نے نظر گھما کر کوشل کی طرف دیکھا اور لمحہ بھر کے لئے چپ چاپ دیکھتی رہی۔ اس کے ہونٹ ضرورت سے زیادہ بھینچے ہوئے تھے۔ جیسے اسے انہیں بھینچ رکھنے کا احساس ہو۔ اس کا رنگ کالا تھا۔ لیکن ہونٹ لال تھے۔ یہ پان کی لالی نہیں تھی۔ لگاتار بھینچے رہنے ہی سے لال ہو گئے تھے۔ کوشل کو سر سے پاؤں تک دیکھ لینے کے بعد وہ منجھی ہوئی تیز آواز میں بولی۔

"ہاں دیکھو۔ دیکھو۔ خوب دیکھو"۔ صرف ہونٹ ہی نہیں۔ بولتے ہوتے اس کا تمام چہرہ ہل رہا تھا۔ اس نے اپنی چھاتی پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"یہ میں ہوں۔ یہ میرا لڑکا ہے۔ یہ میرا دیور ہے اور یہ میرا خاوند ہے"۔

اس نے ایک سانس میں سب کا تعارف کرا دیا اور چپ ہو گئی۔ اس نے ایک معمولی قمیض پہن رکھی تھی۔ جس کے بٹن کھلے ہوئے تھے۔ اچانک ایک جُوں سرسرائی۔ جسے پکڑنے کے لئے اس نے بغل میں ہاتھ ڈالا۔ لیکن

کامیاب نہیں ہوئی ۔ اس نے جب ہاتھ باہر نکالا اور اسے آنکھوں کے قریب لے جاکر دیکھا تو اس میں جُوں کی جگہ قمیص سے ٹوٹا ہوا ذرہ سا کپڑا تھا ۔ اُس نے وہ دُور پھینک دیا اور ہاتھ پھیلی ہوئی ران پر رکھ کر پھر افق پر دیکھنے لگی ۔

" اچھا ۔ تم یہ کھلونے بناتے ہو اور بیچ آتے ہو ؟"

" جی ہاں ۔ کھلونے بناتے ہیں اور بیچ آتے ہیں "

جب وہ یہ بات کہہ رہا تھا اسی وقت ڈبی کے ڈھکن پر لئی لگا کر اس پر نیلے رنگ کا کاغذ چپکا رہا تھا ۔ وہ ہاتھ سے کاغذ پر جتنا دباؤ ڈال رہا تھا ۔ اسی نسبت سے الفاظ پر بھی زور ڈال دیا تھا ۔

" کھلونے بناتے ہیں " لڑکے نے فقرے کو لٹکا کر کہا اور دری پر پڑے ہوئے کھلونوں کو اٹھا کر ٹین کی ایک صندوقچی میں رکھنے لگا ۔

" ٹھہرو ٹھہرو ۔ خشک ہو جانے دو " اس کے چاچا نے منع کیا ۔ اور کھلونے اس کے ہاتھ سے لے کر دوبارہ دری پر بچھا دئے ۔ شاید وہ کھلونے خشک کرنے کے لئے ہی دھوپ میں بیٹھے تھے ۔

" ان کی قیمت کیا ہے ؟" کوشل نے پوچھا ۔

" دیکھئے یہ تین آنے کا ہے ۔ یہ دو آنے کا اور یہ ڈیڑھ آنے کا "

اس نے الگ الگ سائز کے تین کھلونے باری باری اٹھائے اور انہیں مختلف زاویوں سے کھول کر یوں نمائش کی ۔ جیسے کسی گاہک کو دکھا رہا ہو ۔ اور یہ ثابت کیا کہ ان کی یہ سلسلہ وار قیمتیں مقرر کرنے میں

اس نے واقعی عقلمندی سے کام لیا ہے۔

جب کوشل کھلونے دیکھ رہا تھا۔ تو لڑکا پھٹی پھٹی آنکھوں اور عجیب انداز سے کوشل کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ دیکھتا رہا۔ اور پھر یکایک ہرے رنگ کے کاغذ کا ایک ٹکڑا اٹھایا۔ اور اسے اپنی آستین میں چھپالیا۔ حالانکہ کوشل اس کی ہر ایک حرکت کو دھیان سے دیکھ رہا تھا لیکن وہ سمجھتا تھا۔ کہ اُسے کاغذ چھپاتے کسی نے نہیں دیکھا۔ اپنی اس کامیابی پر وہ دل ہی دل میں خوش ہُوا۔ اور یُوں مسکرانے لگا۔ جیسے اپنے چاچا کے فن اور عقلمندی کی داد دے رہا ہو۔

"تمہارا نام کیا ہے"؟ کوشل نے پُوچھا۔

"امیر علی"۔ وہ بولا۔ اور کوشل کی طرف غور سے دیکھنے لگا۔ اس نے اپنا نام اس ڈھنگ سے بتایا تھا۔ جیسے کوئی کسی اجنبی سے کہہ رہا ہو۔ "میں شاعر ہوں" یا افسانہ نگار ہوں"۔ یا پھر "لکھ پتی یا کروڑ پتی ہوں"۔ اس کے لہجے نے مریم کو بھی چونکا دیا۔ اس نے آنکھیں افق سے ہٹا کر امیر علی کی طرف دیکھا۔ اور ناک اندر کو سکوڑ لی۔

"اور تمہارا نام کیا ہے"؟

"مریم"۔ اس کے لہجے میں کسی قسم کا اتار چڑھاؤ نہیں تھا۔ پہلا سا تیکھا پن بھی نہیں تھا۔ بلکہ وہ اب کچھ سنجیدہ ہو گئی تھی۔ یہ سنجیدگی کوشل کو اپنے روّیہ پر تنقید محسوس ہوئی۔ وہ کچھ بے چین سا ہُوا۔ اور معذرت کے انداز میں بولا۔

" آپ لوگ گھبرایئے گا نہیں اور بُرا بھی نہ مانیئے گا۔ میں ویسے ہی پوچھ رہا ہوں۔"

" گھبرائیں گے کیوں ؟ ہمیں کس بات کا ڈر ہے۔ تمہیں جو پوچھنا ہو خوشی سے پوچھو۔ اس لڑکے کا نام نورا ہے۔ اور وہ نورے کا ابّا ہے۔"

مریم نے کہا اور ہونٹ بھینچ لئے۔ اس کی بغل میں پھر سرسراہٹ ہوئی۔ اور اس نے جھٹ قمیص میں ہاتھ ڈالا۔ اور اس مرتبہ وہ جوں کو پکڑنے میں کامیاب ہو گئی۔ پہلے اس نے جوں کو غور سے دیکھا۔ دیکھا۔ اور پھر دونوں انگوٹھوں کے ناخنوں کے درمیان میں رکھ کر چٹاخ سے مار دیا۔ اس نے ناخنوں کو دری پر رگڑ کر پونچھا۔ اور اطمینان سے بیٹھ گئی۔ اس کی نگاہ پھر افق پر جمی ہوئی تھی۔

ایک مرد اور ایک عورت جنہوں نے صاف ستھرے کپڑے پہن رکھے تھے، نزدیک سے گزر گئے۔ نہ انہوں نے ان لوگوں کی طرف دیکھا۔ نہ مریم اور امیر علی نے ان کی طرف۔ جیسے وہ ایک دوسرے کے لیئے بالکل بیگانے ہوں اور الگ الگ دُنیاؤں کے باشندے ہوں۔

(۷)

میدان کے بیچوں بیچ ایک پگ ڈنڈی گذرتی ہے۔ گو یہ پگ ڈنڈی سڑک کی طرح متواتر نہیں چلتی لیکن گاہے گاہے لوگ آتے جاتے رہتے

ہیں - چاندنی چوک سے لال قلعہ اور دریا گنج کی طرف آنے جانے والے لوگوں نے یہ راستہ اپنی مرضی سے بنا لیا ہے - کیونکہ یوں انہیں فاصلہ کم طے کرنا پڑتا ہے - ویسے پریڈ گراؤنڈ کے چاروں طرف پتھر کے کھمبے گاڑ کر تار لگا دی گئی ہے - اور سرکاری طور پر بیچ میں سے گذرنے کی مناہی ہے - لیکن صرف مناہی کر دینے سے کیا ہوتا ہے - جہاں عوام کے دل میں قانون کے لئے عزت اور احترام نہ ہو - جہاں قانون انہیں دبائے رکھنے اور چوسنے کے لئے ہی بنتے ہوں - وہاں قانون کے ذرا ڈھیلا اور کمزور ہوتے ہی لوگ اسے جھٹ توڑ دیتے ہیں - اور اسے توڑ کر مطمئن ہوتے ہیں - اور یہ بھی سچ ہے کہ لوگ جب کوئی کام کرنے پر آتے ہیں - تو وہ کسی قانون کی پروا نہیں کرتے - پہلے پہل شاید انہیں کچھ دقّت ہوئی ہو - لیکن اب یہ پگ ڈنڈی ان کے قدموں سے اس قدر آشنا ہو چکی ہے - کہ سارے میدان سے الگ پہچانی جا سکتی ہے اور شاہراہ عام کی صورت اختیار کر چکی ہے - اب کوئی بھی قانون اُسے میدان کا حصہ نہیں بنا سکتا -

اس پگ ڈنڈی کے دونوں سروں پر نہ کوئی کھمبا دکھائی دیتا ہے اور نہ تار - کافی دُور تک جگہ یُوں کھلی پڑی ہے جیسے وہاں کھمبے کبھی شروع ہی سے لگائے نہ گئے ہوں - اس پگ ڈنڈی کے علاوہ بھی لوگ متعدد جگہ سے میدان کو پار کرتے ہیں - کہیں تاروں کے بیچ سے اور کہیں اُوپر سے گزر جاتے ہیں - وہ قانون کے مقابلہ میں اپنی سہولت کا زیادہ خیال

رکھتے ہیں۔ کئی جگہوں پر تو انہوں نے کھمبوں کو زمین پر گرا کر انہیں تاروں پر سے گذرنے کی سیڑھی بنا لیا ہے۔ انہیں یوں گذرتے دیکھ کر کوشل سوچنے لگتا ہے۔ عوام کا مجموعی ذہن بھی عجیب صنعت و تخلیق کا مالک ہے۔ اُسے اپنی ضرورت کے مطابق راستے بنانا خوب آتا ہے۔"

میدان کی عمر بہت لمبی ہے۔ انگریز اور مغل سلطنتوں کی تو بات ہی کیا وہ کورو اور پانڈو کے راج سے بھی پرانا ہے۔ اگر اس کی موجودہ صورت کو لیا جائے۔ تو جس وقت جامع مسجد اور لال قلعہ تعمیر ہوا تھا۔ اس وقت اس میدان کا نقشہ بھی بنا ہوگا۔ کہتے ہیں۔ کہ کبھی یہ دہلی کی تہذیب اور کلچر کا مرکز تھا۔ یہاں مینا بازار لگتا تھا۔ حسن مسکراتا تھا۔ اور عشق مچلتا تھا۔ نادر شاہ کا قتل عام اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ اور احمد شاہ ابدالی کی حملہ آور فوجوں نے اسے جی بھر کے روندا ہے۔ اس کا نام پریڈ گراؤنڈ تو یقیناً انگریزوں ہی نے رکھا ہوگا۔ کہتے ہیں کہ جنگ سے پہلے ہر سال انگریز فوجوں کی نمائش اس میدان میں ہوا کرتی تھی۔ جس کا مقصد غیر ملکی سامراج کی طاقت اور حشمت کا مظاہرہ کرنا ہوتا تھا۔ اس طاقت اور حشمت کا سب سے بڑا مظاہرہ ۱۹۱۱ء میں ہوا تھا۔ جب غیر ملکی سامراج نے کلکتے کے بجائے دہلی کو اپنی راجدھانی بنایا تھا۔ اس وقت اس میدان میں بڑی دھوم دھام تھی۔ وہ انگریزی سامراج کے عروج کے دن تھے۔ میدان اس کرّوفر اور تمکنت پر دل ہی دل میں مسکرایا تھا۔ اس نے کتنی ہی سلطنتوں کے

عروج و زوال دیکھے ہیں - دوپہر کے بعد دن ڈھل جاتا ہے - یہیں انگریزی سامراج کا سورج بھی ڈھلنا شروع ہوا - اور تھوڑے ہی سالوں میں اس کی شام آپہنچی - جس طرح درختوں اور مکانوں کی اوٹ سے ڈھلتا ہوا سورج اپنی کرنیں میدان پر پھینکتا رہتا ہے - اسی طرح زوال پذیر انگریزی سامراج اب ملکی حکمرانوں کی آڑ سے اپنے پھندے میدان پر پھیلائے ہوئے ہے - ان پھندوں کی گرفت اب بھی کافی کڑی ہے - میدان اس گرفت سے بیزار اور پریشان ہے - اور وہ ہزاروں خانماں برباد اور مصیبت زدہ انسانوں کے دکھ درد اپنے سینے میں چھپائے خاموش پڑا ہے -

سلطنتیں بنتی اور بگڑتی رہی ہیں - میدان کو روندنے والے فنا کی گود میں سوتے رہے ہیں - لیکن یہ میدان لافانی ہے اور اس کے آغوش میں پرورش پانے والے عوام بھی لافانی ہیں - ان میں ایک ازلی اور لامتناہی تعلق قائم ہے - میدان سوچتا ہے - کہ یہ لوگ اس کے پاس اپنے دکھ درد اور سرد آہیں لے کر نہ آئیں - وہ اس کے پاس ہنستے کھیلتے اور گاتے ہوئے آئیں - یہاں آکر وہ فتح کی مسرتوں سے جھومتے اور ناچتے عوامی قوت کا اس طرح جشن منائیں جس طرح یہ سلطنتوں کے بادالی کبھی کبھار مناتے رہے ہیں -

لیکن جب تک لوگوں کی اپنی حکومت قائم نہ ہو جائے - لوگ جشن کیسے منا سکتے ہیں ؟ ان کے حصے میں تو محض دکھ درد ہی آئینگے -

جنہیں ہے کہ وہ میدان کے پاس آتے رہیں گے۔ اور اسے خوشگوار مستقبل کی بات سوچنے پر مجبور کرتے رہیں گے۔ دکھ کی کوکھ سے سوچ جنم لیتی ہے۔

ہاں دکھ کی کوکھ سے سوچ کا جنم ہوتا ہے۔ لیکن جب آدمی کے مقدر میں دُکھ ہی دُکھ ہوں اور دکھ کی مقدار اس کی قوتِ برداشت سے زیادہ ہو۔ تو وہ اسے قوتِ فکر سے عاری اور بے حِس بھی بنا دیتا ہے۔ لیکن دُنیا میں کوئی بھی چیز فنا نہیں ہوتی۔ آدمی جو سوچ کھو دیتا ہے۔ وہ اس میدان کا حصہ بن جاتی ہے۔ اور اس کے ان گنت ذرّوں کو زندگی عطا کرتی ہے۔ اور اب یہ پُورا مَیدان ——— اس کا ایک ایک ذرہ انسان کے لیئے سوچنے کا کام سرانجام دے رہا ہے۔

کوشل جب خاموش راتوں میں بیٹھ کر سوچتا ہے۔ تو اسے میدان میں سچ مچ زندگی کا احساس ہوتا ہے۔ وہ میدان کی رُوح کو اپنی رُوح کے ساتھ سرگوشیوں میں باتیں کرتا ہُوا محسوس کرتا ہے۔

اس وقت بھی رات خاموش تھی۔ ہر ایک چیز پر خاموشی طاری تھی۔ صرف سڑک پر سے کبھی کبھی کوئی موٹر گذر جاتی تھی۔ آسمان میں تارے ٹمٹما رہے تھے۔ اِدھر اُدھر سے سڑک کے کھمبوں اور جامع مسجد کے بلبوں کی روشنی کسی قدر میدان پر پڑ رہی تھی۔ سامنے قلعہ پر بھی ننھے ننھے دو سُرخ قُمقمے روشن تھے۔ لیکن وہ بہت دُور تھے۔ اس لیئے میدان کو روشن کرنے میں ان کا حصہ بہت ہی معمولی اور نہ گنے جانے

کے قابل تھا۔ ہو سکتا ہے کہ کبھی یہ قمقمے سائز میں بڑھ جائیں اور ان کی روشنی سے سارا میدان جگمگا اٹھے۔ اور اس میں پھیلے ہوئے اندھیرے اور کہرے کا ہمیشہ کے لئے انت ہو جائے۔

میدان لمبائی اور چوڑائی میں دور تک پھیلا ہوا سڑک سے پرے تک پھیلتا چلا گیا ہے۔ جتنا یہ میدان وسیع ہے اتنی ہی اس کی رُوح عظیم اور فراخ ہے۔ کئی مرتبہ اس دُھندلے ماحول میں میدان کی یہ رُوح اس کے سینے سے اُوپر اٹھتی ہے۔ کوشل اسے مجسّم دیکھتا ہے۔ اور اس کی سرگوشیاں سنتا ہے۔ پھر یہ عظیم رُوح یکایک بہت سی روحوں میں منقسم ہو جاتی ہے۔ یہ روحیں میدان کے باسیوں کی روحیں ہیں کوئی بوڑھی اور کوئی جوان۔ کوشل ان رُوحوں میں سے بعض کو پہچانتا ہے۔ وہ ان سے بخوبی واقف ہے۔ رفتہ رفتہ یہ جانی پہچانی روحیں ہی کوشل کے سامنے رہ جاتی ہیں۔ باقی فضا میں مدغم ہو جاتی ہیں۔ یہ روحیں نڈر اور بے جھجک کوشل کے اِتنی نزدیک آ جاتی ہیں کہ وہ ان کی سانسوں کی گرمی کو محسوس کرنے لگتا ہے اور خاموش زبان میں ان کی باتیں سننے لگتا ہے۔ یہ باتیں ان کے دکھ درد کی کبھی نہ ختم ہونے والی کہانیاں ہوتی ہیں۔ کہانیوں کے کردار مر جاتے ہیں۔ لیکن کہانیاں زندہ رہتی ہیں۔

یہ ان لوگوں کی روحیں ہیں۔ جو اس میدان کی پناہ میں آتے ہیں جو دنیا کی جد و جہد میں ہار چکے ہیں۔ جو ہمارے بوسیدہ سماج کا چوتھا

طبقہ ہیں - ایک مفلوج عضو ہیں - لیکن افلاج نے انہیں ناکارہ نہیں بنایا - اس میں زندگی ہے اور جینے کی تمنا ہے - اور ان کا مرض لاعلاج نہیں ہے -

(۸)

پگ ڈنڈی کے اس پار بھی لوگ بستے تھے - جامن کے اس گھنے درخت کے سامنے پگ ڈنڈی کے اس پار بھی ایک درخت تھا - لیکن یہ درخت بہت ہی مختصر تھا اور غیر آباد بھی - یہاں کبھی کبھار کوئی اِکّا دُکّا فقیر آ بیٹھتا تھا - اور ایک دو رات گزار کر چلا جاتا تھا - اس درخت سے چند قدم کے فاصلہ پر البتہ میاں بیوی کا ایک جوڑا رہتا تھا - وہ رات کو برساتی تان کر جھونپڑی بنا لیتے تھے - اور اپنے آپ کو سردی اور بارش سے محفوظ کر لیتے تھے - لیکن دن کو برساتی اُتار کر الگ رکھ دیتے تھے اور دُھوپ سے مستفید ہوتے تھے - وہ پگ ڈنڈی کے اس پار بسنے والے لوگوں کو شاید اپنے سے حقیر سمجھتے تھے - اس لئے ان سے ملتے جلتے نہ تھے - کوشل دو چار بار ان کے قریب بھی جا کر کھڑا ہوا تھا لیکن انہیں کسی قسم کی بات چیت کرتے نہیں سُنا - انہوں نے کوشل کی طرف کوئی توجہ نہیں دی - وہ بس اپنے ہی آپ میں مست معلوم ہوتے تھے - ایک چُولہا سا بنا رکھا تھا جس میں ہر وقت آگ جلتی رہتی تھی - مرد اس

آگ میں کچھ جلانے اور پگھلانے میں مصروف رہتا تھا۔کبھی وہ جڑی بوٹیاں اور دھاتیں بھسم کر کے کشتے تیار کرتا اور کبھی کبھی تانبے سے سونا بنانے کی کوشش کیا کرتا تھا۔

کشتے اور سونا بنانے والے ریاکار اور حیلہ ساز ہوتے ہیں۔کوشل نے ایسے لوگوں کو کبھی پسند نہیں کیا۔اس لئے یہ معلوم ہوتے ہی کہ یہ آدمی کشتے تیار کرتا ہے۔کوشل نے اس میں کسی طرح کی دلچسپی لینا چھوڑ دیا۔ وہ صرف پگ ڈنڈی کے اس پار بسنے والوں ہی سے ربط ضبط بڑھا رہا تھا۔جب وہ ان کی باتیں سنتا۔تو ایسا معلوم ہوتا تھا۔کہ جیسے میدان ان لوگوں کی زبانی خود اپنی تاریخ بیان کر رہا ہو۔ جیسے ان کے خلوص اور معصومیت نے اس تاریخ کو زندہ و پائندہ بنا دیا ہو۔

ایک دن جب وہ اس درخت کے نیچے آیا۔نور رفیق اور اس کی بیوی کی طرح امیر علی اور ایک دوسرا آدمی آپس میں لڑ رہے تھے۔ دس گیارہ بجے کا وقت تھا۔ دسمبر کی سرد رات تھی۔ وہ دونوں اپنی اپنی جگہ پر لیٹے ہوئے تھے۔لیکن ان کے پاس اوڑھنے کا کپڑا کافی نہیں تھا۔ اس لئے انہیں نیند نہیں آ رہی تھی۔اور چپ چاپ لیٹے رہنا کچھ ناگوار گذرتا تھا۔چنانچہ وہ لڑ رہے تھے۔پھیپھڑوں کی تمام قوت سے ایک دوسرے پر گالیوں کی بوچھاڑ کر رہے تھے۔عجیب بات تھی۔کہ لڑائی نے مباحثے کا رنگ اختیار کر لیا تھا۔ایک آدمی اپنی بات کہہ چکنے

دانتوں کا منجن تیار کرتا تھا اور مختلف شہروں اور قصبوں میں گھوم کر اسے بیچتا تھا۔ دلی بڑا شہر ہے۔ اس لئے یہاں بہت دنوں تک قیام رہتا تھا۔ صبح شام وہ اس درخت کے نیچے بیٹھا ملتا اور دن بھر گھوم پھر کر منجن بیچا کرتا تھا۔ وہ خوش مزاج اور ظریف الطبع واقع ہوا تھا۔ صبح سویرے ایک سل بٹہ لے کر بیٹھ جاتا تھا۔ شنگرف اور دوسری چیزیں رگڑ کر منجن تیار کرتا تھا۔ رگڑتے رگڑتے جب ذرا تھک جاتا۔ تو جھنیا کو ایک آدھ مذاق کرتا۔ یا اپنے ساتھی کو ذاتی تجربہ کی کوئی بات سنانے لگتا۔ عبدالصمد کا یہ ساتھی بھی خوش مزاج اور ظریف الطبع واقع ہوا تھا۔ یوں سمجھئے کہ اس کا ایک دوسرا روپ تھا۔ وہ ہمیشہ اس کے ساتھ گھومتا اور ہاں میں ہاں ملایا کرتا تھا۔ ویسے اس کا ذاتی تجربہ بھی عبدالصمد کے تجربہ سے کسی طرح کم نہیں تھا۔

ایک دن رات کے نو دس بجے ہونگے۔ اردو بازار کے خاتمہ پر سامنے جو سینما گھر ہے۔ اس کی بجلیاں چمک رہی تھیں اور ریکارڈ بج رہا تھا۔ جس کے بول یہاں بھی صاف سنائی دے رہے تھے ؎

"افسانہ لکھ رہی ہوں دل بے قرار کا"

عبدالصمد نے گانے پر تنقید کرتے ہوئے اپنے ساتھی سے کہا:۔

"سنتے ہو کیا کہہ رہی ہے؟ یہ پڑھی لکھی لڑکیاں اپنے دوستوں کو چٹھیاں لکھ کر بھیجتی ہیں"!

"اور اس دن مراد آباد میں کیا گانا سنا تھا۔ وہ بھی یاد ہے"؟ اس کے

ساتھی نے کہا۔ اور آپ ہی گانے کا یہ بول بھی سنا دیا:۔

"تمہارا پتہ کیا ہے۔ سامنے گلی میں میرا گھر ہے"

اور پھر طنزاً ہنس کر کہا "پتہ صاف بتا جاتی ہیں"۔

"پڑھائی نے اور اس سینما نے شہر کی لونڈیوں کو تو بالکل چوپٹ کر دیا ہے"۔

"وقت وقت کی بات ہے کبھی عورتوں کا برقعے سے باہر نکلنا بھی گناہ سمجھا جاتا تھا۔ اور کہاں اب مسلمانوں کی لڑکیاں بھی کھلے منہ گھومتی اور ناچتی گاتی ہیں۔ دنیا سے شرم وحیا تو سمجھو اٹھتی ہی جا رہی ہے"۔

عبدالصمد ہنس پڑا۔ اس کی ہنسی میں طنز تھا کسی طرح کا رنج یا ملال نہیں تھا۔ یہ ایک ایسی ہنسی تھی۔ جو صرف زندگی کا بوجھ ہلکا کرنے کے لئے ہنسی جاتی ہے۔ بات کرنے کا مقصد صرف ہنسنا ہی ہوتا تھا۔ اس کا بات کرنے کا ڈھنگ بھی عجیب تھا۔ وہ الفاظ کو گھوٹ گھوٹ کر منہ سے نکالتا تھا۔ وقت کاٹنے اور بات چلانے کے لئے کوئی موضوع ہونا چاہیئے سینما کے گانوں نے اب یہ موضوع فراہم کر دیا تھا۔ لیکن اس سلسلہ میں ان کا علم بہت محدود تھا۔ اس لئے یہ سلسلہ آگے نہ چل سکا۔ اور اتفاق سے انہیں قلندر شاہ کے رویہ پر تنقید کرنے کا نیا موضوع مل گیا۔

بات کچھ اس طرح تھی۔ کہ مریم کا خاوند یعنی نورے کا ابا آگ جلا کر چائے تیار کرنے میں مصروف تھا۔ امیر علی پاس بیٹھا خالی برتن ٹھن ٹھنا رہا تھا۔ اور اس کی تان پر کافیہ، ردیف اور بحر سے بے نیاز ایک خود

ساتھ نغمہ الاپ رہا تھا ۔

ہم چائے کے ساتھ کھچڑی کھائیں گے جی

سُر تال کے ساتھ ساتھ اس کا سر بھی ہل رہا تھا۔ جیسے حال آیا ہُوا اور وجد میں جھوم رہا ہو۔

"بڑے میاں"! قلندر شاہ نے آواز دی۔

"کیا حکم ہے شاہ صاحب"! نورے کے ابا نے جواب دیا۔

"ذرا آٹھ آنے کا کش تو لے آؤ۔ ایک چلم ہی پی لیں"۔

"آپ دیکھتے ہیں کہ اس وقت تو میں اپنا کھانا وغیرہ تیار کرنے میں مصروف ہُوں"۔ نورے کے ابا نے قدرے بے رخی اور بے اعتنائی سے جواب دیا۔ ذرا توقف کے بعد وہ پھر اولا ۔ کسی دُوسرے وقت بھی میں آپ کے منہ کو لے آتا ہُوں۔ ورنہ کسی کا نوکر نہیں ہُوں"۔

"دیکھا۔ آج کہیں آٹھ آنے کے پیسے بن گئے ہوں گے۔ جب تک انہیں پھونک نہیں لے گا۔ اسے چین نہیں آئے گا۔ سچ کہا ہے کہ خدا کمینے کو دھن نہ دے۔ دھن اس کی جان کا لاگو بن جاتا ہے"۔ عبدالصمد نے تنقید شروع کی۔ اس نے ایک ہی سُر میں بہت کچھ کہہ ڈالا اور اس سر میں جب منظوم شہ پارے کی تخلیق ہوئی۔ اس کا آخری بند یہ تھا۔

"میرے بس میں ہو۔ تو خدا کی قسم ایسے آدمی کا سر اتار لوں"!

چونکہ اس کے بس میں کچھ نہیں تھا۔ اس لئے کہنے کو بات کہی اور چادر تان کر سو گیا۔

میدان کسی کی اجارہ داری نہیں۔ لوگ آتے ہیں۔ حسب خواہش وہاں قیام کرتے ہیں اور چلے جاتے ہیں۔ ایک دن کچھ نئے چہرے دیکھ کر عبدالصمد کے ساتھی نے کہا۔

"یہ لوگ ادھر نئے آئے ہیں۔ پہلے کبھی نہیں دیکھے"۔

"جتنے دن کاروبار چلتا ہے۔ رہنے کو گھر ہوتا ہے۔ کوئی ادھر نہیں دیکھتا۔ لیکن جب کچھ نہیں ہوتا۔ تو لوگ یہاں آجاتے ہیں۔ قریب سے ایک ادھیڑ عمر ڈاڑھی والے فقیر نے کہا۔ اور وہ انہیں تیز تیز نگاہوں سے دیکھنے لگا۔

"بد بر بدگراونڈ"۔ عبدالصمد نے ہونٹ بھینچ کر اور دھرتی پر زور سے ہاتھ پٹکتے ہوئے کہا "محتاجوں اور دکھیوں کی پناہ گاہ ہے"۔ اس کی نگاہیں میدان کی وسعتوں میں دور تک پھیل گئیں۔ جیسے وہ میدان کی فراخدلی اور غریب نوازی پر فخر کر رہا ہو۔

(۹)

پگ ڈنڈی کے اس طرف جو چھوٹا اور پرانا درخت تھا۔ اس کے نیچے کچھ دنوں سے ایک بوڑھا فقیر پڑا تھا۔ اس کے اعضاء مضمحل ہو گئے تھے۔ اور جسم سوکھ گیا تھا۔ وہ بہت ہی بوڑھا تھا۔ ڈاڑھی اور مونچھوں کے بال سفید تھے اور ان پر دھول جم گئی تھی۔ وہ سارا دن

زمین پر پڑا سسکتا رہتا تھا۔ اس کے پاس صرف ایک پھٹا پرانا کمبل تھا۔ جسے وہ صبح شام اور رات کو اوڑھے رہتا تھا۔ جب دھوپ تیز ہوجاتی تھی۔ تو الگ پھینک دیتا تھا۔ اس کمبل کے علاوہ اس کے جسم پر لنگوٹی تک نہیں تھی۔

ایک چائے والا گھومتا گھامتا ادھر نکل آیا۔ بوڑھے فقیر نے اسے ایک پیالہ چائے دینے کو کہا۔ لیکن چائے والا اسے اپنے گلاس میں چائے پلانے کو تیار نہ تھا۔ اس لئے بوڑھے سے پوچھا "تمہارا ڈبہ کہاں ہے؟"

"ڈبہ، ڈبہ!" بوڑھے نے دو تین مرتبہ صاف لہجے میں دوہرایا۔ اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے اُدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ وہ یاسیت کی تصویر بنا ہوا تھا۔

پیشتر اس کے کہ چائے والا چلا جاتا۔ بڑے درخت کے نیچے سے ایک لڑکا چلّایا "ٹھہرو! ٹھہرو! مَیں ڈبہ لاتا ہُوں"۔

لڑکے نے دو ڈھائی گز کی دھوتی اور کالے رنگ کی ایک واسکٹ پہن رکھی تھی۔ دھوتی مشکل سے اس کے گھٹنوں تک آتی تھی۔ اور واسکٹ پر کوئی بٹن نہیں تھا۔ اس لئے چھاتی کھلی ہوئی تھی۔ اس کے ہاتھ میں پتنگ تھا۔ جسے اڑانے کے لئے وہ ڈور سلجھا رہا تھا۔ لیکن اب اس نے ڈور اور پتنگ وہیں پھینک دی۔ اور ڈبہ اٹھا کر لپکتا ہوا آیا "دو چائے اس میں ڈال دو"۔

لڑکے کا نام رشید تھا۔ اس نے ڈبہ چائے والے کے سامنے رکھ دیا۔ چائے والا چائے ماپنے لگا۔ اور بوڑھے نے ایک کپڑا رشید کی طرف سرکا کر کہا۔ "لو پیسے اسے دے دو۔"

رشید نے کپڑے کو ٹٹولا۔ بڑی احتیاط سے دیکھا اور جھاڑا۔ لیکن اسے پیسے کہیں نظر نہیں آئے۔

"اس میں پیسے نہیں ہیں۔" وہ بولا۔

"کوئی لے گیا ......" بوڑھے فقیر نے گھٹی گھٹی اور لرزتی ہوئی آواز میں پیسے لے جانے والے کو ایک بھونڈی گالی دی اور سر زمین پر ٹیک دیا۔

رشید نے ترحم ریز نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے ڈبہ اٹھا لیا۔ "رہنے دو" چائے والے نے کہا۔ "یہ تھوڑی سی چائے لو اور اسے پلا دو۔"

بوڑھے نے لرزتے ہوئے ہاتھوں سے ڈبہ تھاما۔ اور چائے پینے لگا۔ وہ بدستور لیٹا ہوا تھا۔ لیکن پھر بھی اس کا تمام جسم کانپ رہا تھا۔ جسم کیا تھا۔ ہڈیوں کا ڈھانچہ تھا۔ اس میں جان جانے کہاں اٹکی ہوئی تھی۔ رشید سے اس کی یہ حالت دیکھی نہیں گئی۔ اس نے کوشل کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"آدمی کی بھی کیا زندگی ہے!"

بوڑھے نے بڑی بے صبری سے چائے کا گھونٹ بھرا۔ لیکن وہ

تھی ہی کتنی! دو گھونٹ بھی پورے نہ ہو سکے۔ چائے ختم ہو جانے کے بعد بھی بوڑھے کے ہونٹ ڈبے سے چپکے رہے۔ تھوڑی سی جو پیندے اور کناروں سے لگی رہ گئی تھی۔ وہ اسے بھی اندر کھینچ لینا چاہتا تھا۔ لیکن اس سے کیا بنتا تھا۔ اس نے مایوس ہو کر ڈبہ پھینک دیا۔ اور کراہتے ہوئے سر دوبارہ زمین پر ٹیک دیا۔

رشید نے ڈبہ اٹھانے کی کوشش نہیں کی۔ وہ خاموش اور بے حس و حرکت بیٹھا تھا۔ اس کی نگاہیں بوڑھے پر گڑی ہوئی تھیں۔ وہ زندگی کو تڑپتے اور سسک سسک کر دم توڑتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ اسے یہ منظر بہت ہی بھیانک اور المناک معلوم ہوا۔ کیونکہ وہ نوعمر اور معصوم تھا۔ سماج کی بے رحمی اور سنگ دلی سے واقف نہیں تھا۔ اس کا دل زندگی کے لئے محبت اور عقیدت سے لبریز تھا۔ اس لئے وہ اس کی تذلیل اور بے چارگی دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔ بولا "اچھا ہے۔ خدا تعالےٰ پہلے ہی اٹھا لے"۔

"یہ تمہارا کچھ لگتا ہے؟" کوشل نے دریافت کیا۔

"جی نہیں۔ میں نے تو چائے والے کو کہتے سنا تھا کہ تمہارا ڈبہ کہاں ہے؟۔ اور میں ڈبہ لے آیا۔ کہ بے چارے کو چائے مل جائے"۔

"تم کیا یہاں اکیلے ہی رہتے ہو؟"

"نہیں میرے ابا ہیں۔ اس وقت مانگنے گئے ہیں"۔

"اور ماں؟"

"ماں نہیں ہے۔"

رشید نے جواب دیا۔ اس کی آنکھوں میں اور چہرے کی رنگت میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ جیسے ماں کا نہ ہونا اس کے نزدیک کوئی قابلِ افسوس سانحہ نہ ہو۔ جیسے اس نے ماں کو دیکھا ہی نہ ہو۔ ماں نہیں تھی۔ اور اس کے ننگے سر پر بال بھی نہیں تھے۔ تازے کٹوائے معلوم ہوتے تھے۔

"تمہارے ابا کیا ہمیشہ سے بھیک مانگتے ہیں؟"

"نہیں دنگے سے پہلے ہم لوگ قرول باغ میں رہتے تھے۔ اور وہ درزی کا کام کرتے تھے۔"

"تو اب بھی وہ درزی کا کام کیوں نہیں کر لیتے؟"

"نہیں کرتے۔ ان کی مرضی۔"

رشید نے مختصر الفاظ میں جواب دیا۔ لیکن اتنے ہی میں اس کا اندرونی غم اور افسوس ظاہر ہو گیا۔ اس کے لہجے سے ظاہر ہوتا تھا۔ کہ وہ اس سلسلہ میں کچھ بھی کہنا سننا نہیں چاہتا۔ جیسے اس کے سامنے دنگوں کا قتل و غارت اور وحشت کا منظر ابھر آیا ہو۔ یہ منظر بہت ہی بھیانک اور خطرناک تھا۔ اور وہ اس منظر کو اپنے ذہن سے مٹا دینے کی ہمیشہ کے لئے فراموش کر دینے کی متواتر کوشش کر رہا تھا۔ گھر بار اور ماں کسی چیز کی چاہ اس کے دل میں نہیں رہ گئی تھی۔ اسے صرف کھانا اور کھیلنا پسند تھا۔ اور کھیلنے کے لئے اسے کھلا میدان

ملا ہوا تھا۔ وہ دن بھر کھیلا کرتا تھا۔

دوسرے دن کوشل کی ملاقات رشید کے ابّا جمال سے ہوئی۔ وہ چالیس بیالیس سال کا ادھیڑ عمر آدمی تھا۔ چہرے پر گھنی سیاہ لمبی داڑھی تھی۔ جو جھاڑ جھنکاروں کی طرح الجھی ہوئی تھی۔ جس میں مٹی کنکر خاص مقدار میں اٹکے رہتے تھے۔ کوشل نے جمال کو اس سے پہلے بھی کئی بار دیکھا تھا۔ اور عبدالصمد کے ساتھ اسے باتیں کرتے سنا تھا۔ جھنیا کے قریب ہی باپ بیٹے کا ڈیرا تھا۔ جمال نے دو بیلے پال رکھے تھے۔ جن میں سے ایک مادہ اور دوسرا نر تھا۔ اس نے مادہ کا نام شہزادی اور نر کا نام شہزادہ رکھ چھوڑا تھا۔ جب کوشل وہاں آیا۔ جمال شہزادے کو تیل پلا رہا تھا۔ وہ شیشی ہاتھ میں لئے تیل آہستہ آہستہ اس کے نتھنوں پر انڈیل رہا تھا۔ اور شہزادہ اسے چاٹ رہا تھا۔ جب وہ تیل پی چکا تو جمال نے اس کے نتھنوں اور جبڑوں کو کپڑے سے پونچھا۔ تھوتھنی پکڑ کر اس کا منہ چوما۔ پچکارا۔ اور پھر اس کے دونوں کانوں کو پکڑ کر انہیں سر سے اوپر آپس میں ملا دیا۔ وہ اسے کئی منٹ تک پیار کرتا اور پچکارتا رہا۔ پھر تھپتھپا کر الگ کرتے ہوئے کہا "بس جا! اب کھیل!"

جمال نے شہزادے کو الگ چھوڑ کر بیڑی سلگائی اور پینے لگا۔ وہ اکڑوں بیٹھا تھا۔ اور دھوآں یوں چھوڑ رہا تھا جیسے کوئی خاص بات سوچ رہا ہو۔ بات خاص ہی نہیں مسرت انگیز بھی تھی۔ کیونکہ

وہ سوچتے ہوئے لگا ہے گا ہے مسکراتا بھی جاتا تھا۔ مسکراہٹ آنکھوں میں اور ہونٹوں پر بیک وقت پیدا ہوتی تھی۔ جس سے یہ اندازہ بآسانی لگایا جاسکتا تھا۔ کہ مسکراہٹ اس کی روح کی گہرائیوں سے پیدا ہوتی ہے۔ اور اسے سرتاپا مسرور کر رہی ہے۔

جمال کے سر پر ایک پنجرا لٹک رہا تھا۔ کوشل نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ "کیا یہ بھی آپ ہی کا ہے؟"

"جی ہمارا ہے۔ چھوئیے گا نہیں۔ جانور ہے کاٹ کھائے گا۔"

"کیا جانور ہے اس میں؟"

"چھپکلی"

"لیکن چھپکلی تو کاٹا نہیں کرتی۔ اور وہ اس میں کہیں نظر بھی نہیں آتی۔"

"یہ افریقہ کی چھپکلی ہے۔ اس کپڑے پر بیٹھی ہوگی۔"

پنجرے میں ایک کپڑا بچھا ہوا تھا۔ کوشل نے ایڑیاں اٹھا کر دیکھنے کی بہت کوشش کی۔ لیکن چھپکلی اسے پھر بھی کہیں نظر نہیں آئی۔

"یہ کھاتی کیا ہے؟ آپ نے تو اس کے لئے کوئی پیالی وغیرہ بھی نہیں رکھی ہوئی۔"

"یہ بس ہوا کھاتی ہے" ۔ جمال نے جواب دیا۔ اور مسرت میں بھر کر مسکرا دیا۔

"خالی ہوا؟ عجیب چھپکلی ہے"۔

اور آٹھ انڈے ہر روز دیتی ہے"!

"نہیں۔ یہ تو ممکن نہیں ہو سکتا" کوشل بولا۔

"ممکن کیوں نہیں؟ پوچھ لیجئے آپ سے۔ کیوں بڑی بی ٹھیک ہے نا؟"

اس درخت کی جڑ میں ایک چھوٹی سی جھونپڑی تھی۔ جس میں بڑھیا بی رہتی تھی۔ بڑی بی اسے جانے کیوں کہا جاتا تھا۔ دیکھنے سے تو اس کے مرد ہونے کا گمان ہوتا تھا۔ جسم ننگا۔ سر پر فقیروں کی طرح لمبے لمبے بال اور ہاتھ میں ہر وقت چلم رہتی تھی۔ اور سلفے کے کش لگتے تھے۔ کوشل نے اسے دیکھا تو کئی بار تھا۔ لیکن بولتے آج پہلی مرتبہ سنا تھا۔

"کیا بات؟" بڑی بی نے پوچھا۔ اور جمال کی طرف یوں دیکھنا شروع کیا۔ جیسے اسے کسی بہت ہی اہم مسئلہ کا فیصلہ کرنا ہو۔

"یہی کہ ہماری چھپکلی آٹھ انڈے روز دیتی ہے"!

"ہاں دیتی ہے"۔ بڑی بی نے تائید کی۔ اور مزید کہا۔ "اور انڈا بھی اتنا اتنا بڑا؟"

اس نے انڈے کا جو سائز بتایا تھا۔ وہ ٹینس کھیلنے کی گیند سے کم کیا ہوگا۔ اور بتانے کے بعد بڑی بی اور جمال دونوں ہی پر کیف انداز سے کھلکھلا کر ہنس پڑے تھے۔

کوشل بھی ہنس پڑا۔ ان کی ہنسی نے اس کی روح کو بھی چھو لیا

تھا۔ اور اس پر ایک راز کا انکشاف ہوا تھا۔ جو چھپکلی نظر ہی نہیں آتی۔ جو محض ہوا کھا کر زندہ رہتی ہے۔ وہ اتنے تو کیا اس سے بھی بڑے بڑے انڈے دے سکتی ہے۔

"تب تو صاحب خوب ہے"۔ کوشل نے کہا اور وہ پھر مسکرا دیا۔

× × × × × ×

"ہوں چاول کا پتہ نہیں۔ وہی جو ایسے ٹھونسے جاتے ہیں"۔

جھنیا عبد الصمد کے بستر پر بیٹھی تھی۔ کھانا کھاتے وقت جیسے لقمہ منہ میں ڈالا جاتا ہے ایسے ہاتھ منہ کے قریب لے جا کر اس نے یہ بات کہی تھی۔ اس کے ہونٹ مسکرا رہے تھے اور آنکھیں ناچ رہی تھیں۔

بات چیت کا سلسلہ پہلے سے جاری تھا۔ جھنیا کا خاوند وہاں موجود نہیں تھا۔ اس لئے عبد الصمد اور اس کے ساتھی کو دل بہلانے کا موقع ملا تھا۔ وہ جھنیا کو ہاتھ مٹکاتے اور آنکھیں نچاتے دیکھنا پسند کرتے تھے۔ وہ اس کی باتوں سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ باتیں اگرچہ بے ربط اور بے معنی تھیں۔ لیکن جھنیا کی مسکراہٹیں انہیں معنی عطا کر رہی تھیں۔

"بتاؤ تو چاول کونسے درخت پر لگتے ہیں؟" عبد الصمد کے ساتھی نے بات کا رس لیتے ہوئے کہا۔

"درخت پر کہاں لگتے ہیں۔ بوئے جاتے ہیں"۔ جھنیا جھنجھنائی۔ اور وہ دونوں ہنس پڑے۔

" اچھا۔ بتاؤ تو بھلا کیسے بوٹے جاتے ہیں؟"

" ایسے ہی جیسے گنا بو یا جاتا ہے"۔ جھنیا نے وثوق سے کہا۔ اور ذرا توقف کے بعد پھر بولی "تم کیا سمجھتے ہو کہ مجھے کچھ پتہ ہی نہیں۔ ہمارے تو کھیت ہوتے تھے۔ چاول گیہوں سب بوتے تھے۔ اب یہاں کوڑھیوں میں آپڑی ہوں"۔

" کوڑھیوں میں آپڑی ہوں" کے الفاظ سے جو تاسف اور محرومی کا احساس پیدا ہوتا تھا۔ وہ جھنیا کے چہرے پر نمایاں نہیں تھا۔ وہ بدستور مسکرا رہی تھی۔ عبدالصمد اور اس کے ساتھی پر بھی ان الفاظ کا کوئی ناخوشگوار اثر نہیں ہوا۔ وہ بھی مسکرا رہے تھے۔

" اچھا تو پھر حکم دے دیا جائے۔ کہ اس بار پریڈ گراؤنڈ میں گیہوں بو دیا جائے"۔ عبدالصمد نے زمین پر ہاتھ ٹیک کر کہا۔ اور وہ ہنس پڑا۔

وہ تینوں میدان کی وسعتوں میں جھانک رہے تھے۔ اور کوشل سوچ رہا تھا۔ کہ جھنیا۔ عبدالصمد۔ اس کا ساتھی، جمال اور بڑی بی سب بجھارتیں ہیں۔ زمانہ انہیں نظر انداز کر رہا ہے۔ ان کی شکل و صورت کو مسخ کیے جا رہا ہے۔ مگر انہیں روز ازل سے بوجھے جانے کی تمنّا ہے۔ حیرت ہے کہ کوئی انہیں بوجھنے اور سمجھنے کی کوشش نہیں کرتا۔ نہ کرے وہ تاریخ کے جزو ہیں۔ اور تاریخ ان کے متعلق یہ بے اعتنائی اور یہ بے عزتی کبھی برداشت نہیں کر سکتی۔ انہیں ایک نہ

ایک دن ضرور بوجھا جائے گا۔ اور سمجھا جائیگا۔

(۱۰)

چند قدم کے فاصلہ پر مریم تنہا بیٹھی تھی۔ وہ ایک پتھر کی مورتی کی طرح بے حس و حرکت تھی۔ لیکن اس کی آنکھیں افق پر گڑی ہوئی تھیں۔ یکایک وہ حرکت میں آئی۔ اور قمیض میں ہاتھ ڈال کر گردن کھجلانے لگی۔ شاید اُسے جُوں نے کاٹا تھا۔ قریب ہی نورا گولیوں سے کھیل رہا تھا۔ اس کی آنکھیں ڈھیڈ سے بھری ہوئی تھیں۔ کالے رنگ کا ایک کتا اُدھر آنکلا۔ اور اس کی گولیوں کو سونگھنے لگا۔ نورے نے ایک قمچی اٹھا کر اسے پیٹنا شروع کیا۔ وہ چوں چوں کرتا زمین پر لیٹ گیا۔ نورا اسے بدستور مارتا رہا۔ کیونکہ کتے کی فریاد سننے والا اس کا چچا امیر علی وہاں موجود نہیں تھا۔ یہ وہی کتا تھا۔ جس کی وجہ سے امیر علی اس رات عبدالصمد کی حیثیت بگاڑ رہا تھا۔

مریم سے ذرا پرے ہٹ کر موٹے جسم کی ایک دوسری عورت بیٹھی تھی۔ اس کے سامنے ایک صندوقچی کھلی پڑی تھی جس میں آئینہ۔ تیل اور پان سپاری رکھی رہتی تھی۔ اس کے ہاتھ میں کنگھی تھی اور وہ اسے کبھی کبھی بالوں میں پھیر لیتی تھی۔ کوشل نے جب بھی اسے دیکھا اس کے ہاتھ میں کنگھی ضرور ہوتی تھی۔ اس دن جھنیا نے اسے مذاق کرتے

ہوئے کہا تھا "اری گڑیا! کیا کر رہی ہو"؟ اور پھر خود ہی ہاتھوں کو نچاتے ہوئے کہا تھا "گڑیا کنگھی کر رہی ہے۔ گڑیا آئینہ دیکھ رہی ہے"۔ یعنی اس کا نام گڑیا تھا۔ اس کا گھر والا جامع مسجد کے سامنے پیر بیرے بھرے سرور سامری کی درگاہ کے پاس بیٹھا انگوٹھیاں بیچا کرتا تھا۔ جن میں حجاز سے آئے ہوئے متبرک نیلم کے نگینے لگے ہوتے تھے۔ ان انگوٹھیوں کی خوبی یہ تھی۔ کہ انہیں پہن کر لوگوں کی آرزوئیں بر آتی تھیں۔ ادھر اس کا خاوند لوگوں کی آرزوئیں پوری کرتا تھا۔ اور ادھر گڑیا یہاں بیٹھی بالوں میں کنگھی کیا کرتی تھی۔ اُسے چپ بیٹھے دیکھ کر یہ شک گزرتا تھا کہ وہ گونگی ہے یا پھر اس کے پاس کہنے کے لئے کچھ نہیں ہے۔ اس نے بھی داہیں ہاتھ کی ایک انگلی میں نیلم کی انگوٹھی پہن رکھی تھی ــــــ شاید اس کی سب آرزوئیں پوری ہو چکی تھیں۔ اور شاید اسی لئے وہ چپ رہتی تھی۔ کیونکہ جب آدمی کی سب آرزوئیں پوری ہو جائیں۔ تو اسے کچھ کہنے سننے اور جد وجہد کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ وہ منہ میں زبان رکھتے ہوئے بھی گونگا ہے۔ حسرتیں اور آرزوئیں ہی زندگی کو زندگی بناتی ہیں۔ انسان کو حرکت میں لاتی ہیں اور اس کے دل میں جد وجہد کی تحریک پیدا کرتی ہیں۔ خون چوسنے پر قائم اس سماج کے محافظ مذہبی رہنما اور بدھ سے لے کر آج تک کے اصلاح پسند اور ریفارمر انسان کو خواہشات کے تیاگ کا اپدیش کرتے آئے ہیں۔ تاکہ اس میں جد وجہد کا جذبہ ہی مر جائے۔

اور وہ پتھر کی بے حس و حرکت مورتی بن جائے۔ تاکہ اس سے سماج اور اس کی روایتوں کے لئے کوئی ڈر باقی نہ رہ جائے۔

گرڑیا بھی ایک مورتی تھی۔ گونگی اور بے حس۔ اس کا خاوند دونوں وقت کا کھانا خرید لاتا تھا۔ یہ دونوں کھاتے تھے۔ اور سو رہتے تھے۔ دن رات کا یہ لامتناہی تسلسل گرڑیا کی آنکھوں کے سامنے سے گذرتا رہتا تھا۔ اور وہ اسے چپ چاپ دیکھتی رہتی تھی۔

اس درخت سے تھوڑی دور آگے چل کر لکڑی کے اسٹال بن رہے تھے۔ جو اس وقت سے بننے شروع ہوئے تھے۔ جب سے شرنارتھیوں کو چاندنی چوک سے اٹھا دیا گیا تھا۔ وہ لوگ ہر روز یہاں آتے تھے سکیمیں بناتے تھے۔ دوکانیں کھلیں گی۔ شاندار منڈی بنے گی۔ جس کا نام بھگت سنگھ مارکیٹ ہوگا۔ خوب سودا بکے گا۔ کوشل ان کی باتیں سنتا تھا اور سوچتا تھا۔ "اس سرمایہ دارانہ نظام میں شہیدوں کے نام پر دکانداری چلتی ہے۔ سودا بکتا ہے۔ اگر اس وقت بھگت سنگھ پھر پیدا ہو جائے اور شہیدوں کے نام پر دکانداری کرنے والوں پر اعتراض کرے تو اُسے ضرور رُوس کا ایجنٹ گردان کر جیل میں ڈال دیا جائے۔ اور کچھ تعجب نہیں کہ بغاوت کا الزام عائد کر کے پھانسی لگا دیا جائے"۔

باتیں ہوتی رہیں اور سکیمیں بنتی رہیں۔ لیکن مارکیٹ نہ بن سکی۔ کیونکہ فوجی افسروں نے میونسپلٹی کو یہ جگہ دینے سے انکار کر دیا تھا۔ اب شرنارتھی ادھر نہیں آتے تھے۔ اور لکڑی کے کھوکھے بھی آہستہ آہستہ

اُٹھ گئے تھے۔ پر بڈ گراؤنڈ پھر بھی بڈ گراؤنڈ تھا۔ وہ محتاجوں۔ غریبوں اور بے گھر لوگوں کی پناہ گاہ تھا۔ اور کھیل کود کی جگہ تھی۔ اسے منڈی بننا منظور نہیں تھا۔ اس کی روح بیدار تھی۔ اور بیدار روح آزادی کو جان سے کہیں عزیز رکھتی ہے۔

میدان کی گود سب کے لئے کھلی ہے۔ سینکڑوں آدمی دن بھر اِدھر اُدھر پڑے دُھوپ سینکا کرتے ہیں۔ جنہیں رات کو سردی کے مارے نیند نہیں آتی۔ وہ یہاں پھیل کر سوتے ہیں۔ کچھ لوگ مالش کرتے ہیں۔ گپیں ہانکتے ہیں۔ سلفہ پیتے ہیں۔ اور کبھی بہت سے لوگ بیک وقت جمع ہو کر بینت بازی کرتے ہیں۔

کوشل میدان سے جتنا ربط ضبط بڑھا رہا تھا۔ اتنا ہی وہ اس کا رازدان ہوتا جا رہا تھا۔ میدان نے اپنا دل کھول کر اس کے سامنے رکھ دیا تھا۔ جو فیاض اور حسین تھا۔ اس کے سینے پر جو داغ دھبے تھے۔ وہ صرف بیرونی تھے۔ اس کے دل پر ان کا کوئی اثر نہیں تھا۔ اور وہ میدان کے اپنے نہیں تھے۔ سماج کی کیچڑ کے تھے۔ جو کسی وقت بھی دُھل سکتے تھے۔

کوشل اِدھر اُدھر گھومتا اور چاروں طرف نظر ڈالتا ہوا مزار کی طرف چلا۔ نور اللہ شاہ کی قبر کے پاس وہی عورت بیٹھی تھی۔ جو اس دن ابراہیم کے ساتھ کھانا کھا رہی تھی۔ اس کے پاس چار پانچ عورتیں اور بیٹھی تھیں۔

"ابراہیم کہاں ہے؟" کوشل نے بات کرنے کی راہ نکالی - ویسے وہ جانتا تھا - کہ ابراہیم یہاں نہیں ہوگا - اس وقت وہ اپنے کام پر جاتا ہے -

"معلوم نہیں ہے - یہیں ہوگا کہیں"- عورت نے جواب دیا - اور ایک تنکے سے دانتوں کی ریخوں کو کریدنا شروع کیا -

"یہ عورتیں تو یہاں نہیں رہتیں"؟

"نہیں - اُدھر چوراہا بیرم خاں کی طرف جو فقیروں کی بستی ہے - اس میں رہتی ہیں - یہاں صرف ملنے آئی ہیں"-

"تمہاری واقف ہیں"؟

"ہاں - ہم سب ایک ہی برادری کے لوگ ہیں - سب سائیں ہیں - آپس میں رشتے ناطے ہیں"-

یہ عورت بہت ہی سیدھی سچّی بات کرتی تھی - اس میں بناوٹ اور لاگ لپیٹ کا شعبہ تک نہیں تھا - جیسی وہ باتیں کرتی تھی - ویسی ہی خود بھی سچی اور بے خوف تھی - کوشل نے اسے کئی مرتبہ لوگوں کو بُری طرح پھٹکارتے اور ڈانٹتے دیکھا تھا - ایک دن وہ ایک فقیر سے کہہ رہی تھی - "تم بھی آدمی ہو - بولتے شرم نہیں آتی بیٹی کے ......"! اس نے گالی دی اور کہا :- "پاخانے جاکر چوتڑ تو تم دھوتے نہیں اور بنتے ہو فقیر - تم فقیری کو ذلیل کرتے ہو - اور جیسے ہو ویسی ہی جگہ پڑے ہو - خدا گوبر کے کیڑے کو پھول پر نہیں بٹھاتا - دیکھتے نہیں ہو تمہارے

یہ کپڑے کتنے گندے ہیں۔ بہن کے ...... یہ بھی فقیر بنتے ہیں"۔

اور وہ فقیر گالیاں سن کر بھی خوش تھا۔ انہیں ماں کے دودھ کی طرح پی گیا تھا۔ اکہرے جسم کی یہ عورت کوشل کو پسند تھی اور اس بستی کی ہیروئین معلوم ہوتی تھی۔ اس سے بولنے اور بات کرنے کو جی چاہتا تھا۔ اپنے لوگوں سے اس کا رویہ کیسا ہی کرخت ہو لیکن اجنبیوں اور خصوصاً پڑھے لکھے لوگوں سے بات کرتے وقت وہ شائستہ اور مہذّب ہو جاتی تھی۔ اور اس کی آواز اس میدان کی طرح چٹیل اور ہموار ہوتی تھی۔

لیکن میدان سب جگہ سے ہموار نہیں تھا۔ یہیں سے دو چار گز کے فاصلے پر ڈھلوان شروع ہوتی تھی۔ وہاں ایک پنجابی کنبہ ڈیرا جمائے ہوئے تھا۔ چودہ پندرہ برس کا ایک گوراچٹا لڑکا ایک نیا ولایتی باجہ۔ پنجبارا لئے بیٹھا تھا۔ لڑکے کا نام رونق علی تھا۔ کوشل اس سے بخوبی واقف تھا۔ ایک دن بڑی بی نے اسے پکارا تھا:۔

"او۔ پنجابی لڑکے! ادھر آنا۔ کہاں بازار جا رہے ہو؟ اچھا سنو! یہ چار پیسے کا تیل ہمارے لئے بھی لیتے آنا"۔ اس وقت سے کوشل اسے جانتا تھا۔ اور ادھر سے گذرتے وقت اکثر اس سے بات کیا کرتا تھا۔ اس کے ذریعہ سے وہ کنبے کے دوسرے لوگوں سے بھی واقف ہو گیا تھا۔ اسے پنجابی میں بات کرتے سن کر رونق علی کے باپ نے کہا تھا۔ ہمارا وطن بھی پنجاب ہے۔ پر آٹھ دس سال سے ادھر ہی رہتے

ہیں "

وہ فساد اور تقسیم سے پہلے ادھر آ گئے تھے۔ شاید اس لئے شرنارتھی نہ کہلا کر فقیر کہلاتے تھے۔ اب وہ یو پی کے کسی گاؤں میں رہتے تھے اور محنت مزدوری کر کے پیٹ پالتے تھے۔ رونق علی سے بڑی ان کی ایک لڑکی تھی۔ بھائی کی طرح گوری چٹی۔ گول گول چہرہ۔ گٹھیلا جسم نرم اور گداز تھا۔ وہ بڑی شوخ اور الہڑ تھی۔ وہ جوان بے شک ہو گئی تھی۔ مگر جوانی سے متعلق جذبات سے یکسر ناواقف اور بے خبر تھی۔ اس معصومیت اور بھولے پن نے سونے پر سہاگہ کر دیا تھا۔ اس کا دیہاتی حسن چمک اٹھا تھا۔ اس میں مقناطیس کی کشش تھی۔ جو فطرتاً انسان کو اپنی طرف کھینچتی تھی۔ ایک دن جب کوشل ادھر سے گذر رہا تھا۔ اس کی کمر پر کھجلی ہوئی۔ اس نے جھٹ پٹ قمیض اتار دی۔ اور ماحول سے بے خبر جوئیں دیکھنے لگی۔ یہ خیال اس کے دل میں پیدا ہی نہیں ہوا کہ وہ جوان ہے۔ اور کسی کی حریص نگاہیں اس کے کنوارے جسم اور کھلی چھاتیوں پر پڑ سکتی ہیں۔ چٹان خوبصورت ہوتی ہے۔ برف کا لبادہ اسے ہمیشہ ڈھکے نہیں رہتا۔ کسی کی نظر اس پر پڑتی ہے تو پڑے۔ وہ اسے چھید نہیں سکتی۔ پگھلا نہیں سکتی۔ چٹان۔ چٹان اور نظر نظر رہے گی۔

کوشل رونق علی کے پاس گیا۔ اور اس کا باجہ دیکھنے لگا۔ رونق علی نے اس میں سے کاغذ کا ایک پرزہ نکالا۔ اور اسے کوشل کے ہاتھ میں

تلملاتے ہوئے پُوچھا۔ "اس پر کیا لکھا ہے"؟ کوشل جب یہ پرزہ پڑھ رہا تھا۔ تو وہ چنچل اور بھولی لڑکی بھی بھاگ کر وہاں آگئی۔ اور اس نے اپنے ہاتھ گھٹنوں پر رکھ کر جسم کو ایسے جھکا دیا۔ کہ اس کا منہ ٹھیک کوشل کے کندھے پر تھا۔ اور وہ پُر اشتیاق نگاہوں سے کاغذ کے ان پُرزے پر لکھے ہوئے الفاظ کو دیکھ رہی تھی۔ جیسے وہ الفاظ نہیں۔ جادو جگانے کا منتر ہو۔ پڑھنے کے بعد کوشل نے اپنی زبان میں انہیں بتایا۔ اس میں لکھا ہے کہ یہ بہت بڑھیا باجا ہے۔ اور اٹلی سے بن کر آیا ہے۔ جلد خراب نہیں ہوگا۔

"ایا! کاغذ میں لکھا ہے کہ یہ باجا اٹلی میں بنا ہے"۔ لڑکی نے ذرا پرے بیٹھے ہوئے اپنے باپ کو الفاظ کے طلسم سے آگاہ کیا۔

"اچھا تو اِدھر آ۔ میری بات سُن"!

"اوہوں" ۔ اس نے گردن ہلا کر انکار کیا ۔ اور کوشل سے بولی۔

"ہم یہ بازار سے آٹھ روپے میں لائے ہیں"۔

"کون بجایا کرے گا اِسے"؟

"مَیں نے خریدا ہے۔ مَیں بجایا کرونگا" اس سے پیشتر کہ لڑکی کوئی جواب دیتی۔ رونق بول اُٹھا۔

"اور تم"؟

لڑکی جسم کا تمام بوجھ دائیں گھٹنے پر ڈال کر بائیں ہاتھ سے پیٹ کھجلانے لگی۔ اور اس نے بھیلی بھیلی نگاہوں سے رونق کی طرف ایسے

دیکھا جیسے اُسے بددُعا دینا چاہتی ہو۔ مگر وہ بھولا پن ہی کیا۔ جو کسی کا بُرا چاہے۔ دوسرے ہی لمحہ ان خوبصورت آنکھوں کا جذبہ بدل گیا۔ ان میں لڑکی کے دل کی خواہش نمایاں تھی۔ جو کہہ رہی تھیں " چاہتی تو ہوں کہ میں بھی بجاؤں۔ مگر یہ اس کی چیز ہے۔ وہ مجھے کیوں دے گا؟ کاش! ایک باجا میرے پاس بھی ہوتا "۔

" جا مُنو! دوکان سے چاول لے آ " اس کے باپ نے پھر کہا۔ اور لڑکی نے سر ہلا کر پھر انکار کر دیا۔ وہ باجے کو جی بھر کر دیکھتا۔ اُسے چھُونا اور اس کے بارے میں باتیں سُننا پسند کرتی تھی۔ جیسے اس کے اندر چھپے ہوئے راگ کو اپنی رُوح میں بھر لینا چاہتی ہو۔

" مر جائے تو سنتی نہیں۔ اچھا نہ جا۔ کھانے کو نہیں ملے گا "۔

اس کا باپ جھنجلا رہا تھا۔ غصے ہو رہا تھا۔ مگر مُنو یوں کھڑی تھی۔ جیسے اس نے باپ کی بات سُنی ہی نہ ہو۔ اور دوسرے ہی لمحہ جب وہ جوتا پہن کر خود جانے لگا۔ وہ دوڑ کر جھٹ اس کے پاس چلی گئی۔ اور بولی " لاؤ دو پیسے۔ میں جاتی ہوں "۔

رونق نے کوشل کو بتایا کہ وہ آج شام کو چلے جائیں گے۔ وہ فقیر ضرور ہیں لیکن بھک منگے نہیں۔ اپنا کام کرتے ہیں۔

کوشل آگے بڑھا۔ نور رفیق کی بیوی کو دیکھا۔ وہ پڑوسن سے میاں کی شکایت کر رہی تھی "۔ اسی بات پر تو لڑائی ہوتی ہے۔ وہ شک کرتا ہے کہ میں غیر مردوں سے بولتی ہوں۔ تم جانو۔ میں کہیں بولتی

ہوں"۔

کوشل نے اس کی طرف کوئی توجہ نہیں دی بلکہ مزار کے گرد جو
نار لگی ہوئی تھی، اس کے قریب کھڑا ہو کر قبروں کو دیکھنے لگا۔ اس نے
کل کسی کو باتیں کرتے سنا تھا۔ کہ جس فنکار نے جامع مسجد پر نقاشی کی
ہے۔ اس کی قبر بھی پریڈ گراؤنڈ میں بنی ہوئی ہے۔ وہ جاننا چاہتا تھا۔
کہ اس فنکار کی قبر کونسی ہے۔ اور اس کا نام کیا ہے۔ اتفاق سے بندے
سائیں کا گذر اُدھر سے ہوا۔ اور کوشل نے اس سے دریافت کیا۔

"یہ قبریں کن لوگوں کی ہیں"؟

"ہمیں تو اپنی بھی خبر نہیں"۔ بندے سائیں نے جواب دیا اور
سر ہلاتے ہوئے وہ اپنی ہی دھن میں آگے بڑھ گیا۔

کوشل اس کی بات پر دل ہی دل میں ہنسا اور مسکراتے ہوئے
چل پڑا۔ جب زندہ اور موجودہ انسان کے بارے ہی میں ہمارا علم
اُدھورا ہے۔ اور ہم اس کے متعلق جاننے کی خواہش بھی نہیں رکھتے۔
تو ماضی کی کون خبر لے۔ جو قبر میں پڑا ہے۔ بہتر ہے اسے آرام سے
سونے دیا جائے۔ دھرتی کے آغوش میں جانے کتنے فنکار گمنام پڑے
ہیں اور ان کی تخلیقات پر شہنشاہوں کے نام کندہ ہیں۔ فنکار بیچاروں
کا کوئی نام تک بھی نہیں جانتا۔ جاننے کی ضرورت ہی محسوس نہیں
ہوتی۔

میونسپل نل سے جو پانی آتا ہے اس سے میدان کو ربڑ کی موٹی سی نلی لگاکر سینچا جاتا ہے۔ لیکن بعض مرتبہ نل آپ ہی آپ کھل جاتا ہے۔ اور پانی میدان میں پھیل جاتا ہے۔ آج بھی ایک جگہ پر کھل گیا تھا۔ اور زمین میں سے پانی فوارے کی طرح اُوپر اچھل رہا تھا۔ اور پھر ادھر اُدھر پھیل کر میدان میں بکھر رہا تھا۔ پانی کا زور کچھ زیادہ تھا۔ اس لئے فوّارہ بہت اُونچا امڈ رہا تھا۔ کچھ لوگ جمع ہوکر یہ تماشا دیکھ رہے تھے۔ اور مُنو بھی ان کے درمیان کھڑی تھی۔ لیکن جب کوشل وہاں پہنچا۔ تو وہ جلدی جلدی بازار کی طرف چل پڑی۔ شاید اُسے چاول لانے کی بات یاد آگئی تھی۔ جب وہ پانی کا تماشا دیکھ رہی تھی۔ تو اس نے اُوپر کو جھانکتے ہوئے قمیص کا ایک سِرا پکڑ کر دانتوں میں دبا لیا تھا۔ اور وہ اسے بچوں کی طرح چبا رہی تھی۔ بازار کو جاتے وقت بھی قمیص کا دامن بدستور اس کے دانتوں میں تھا اور وہ تخیل میں کھوئی ہوئی سی آگے بڑھ رہی تھی۔

کوشل بھی اسی طرف جا رہا تھا۔ اس کی نظریں مُنو پر لگی ہوئی تھیں۔ چونکہ وہ جلدی جلدی چل رہی تھی۔ اس لئے کوشل نے بھی قدم تیز کردیا۔ اس کا جی منو سے باتیں کرنے کو چاہتا تھا۔ وہ اس کے نزدیک پہنچا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے ٹھہر گیا۔ اور جدھر منو جا رہی

تھی - اس سے مختلف سمت میں چلنے لگا - اسے یکایک خیال آیا - کہ کوئی اسے یوں چلتا دیکھے گا - تو سمجھے گا - کہ شاید وہ اس لڑکی کا تعاقب کر رہا ہے -

اب وہ ہوش میں تھا - اسے خود اپنے آپ پر شک گذر رہا تھا - اور وہ سوچ رہا تھا - کہ آخر اس طرح مُنّو کے پیچھے چلنے کا مقصد کیا تھا - مقصد دراصل کچھ بھی نہیں تھا - وہ پنجابی لڑکی تھی - الہڑ اور معصوم ! اس میں ایک گونہ کشش تھی - اور کوشل ان جانے ہی اس طرف کھنچا جا رہا تھا - کبھی ہیر بھی اسی طرح الہڑ اور معصوم ہوگی !

مُنّو تو خیر الہڑ اور معصوم تھی - تندرست اور خوبصورت تھی - جاذب نظر تھی - اس کا تعاقب کرنے کی وجہ بھی ہو سکتی تھی اور شک بھی گذر سکتا تھا - لیکن وہ جھنیا ! کیا اس کے بارے میں بھی شک کی گنجائش تھی ؟ ایک ناخوشگوار واقعہ اس کے ذہن میں اُبھر آیا -

ایک روز جب وہ جمال کو اپنے شہزادے سے لاڈ لڑاتے دیکھ رہا تھا - جھنیا ایک نیلے رنگ کے چمک دار منکے سے کھیل رہی تھی - منکے میں اس نے ایک سفید دھاگا پرو رکھا تھا - جس کے دونو سروں کو وہ بائیں ہاتھ سے پکڑے ہوئے تھی - اور دائیں ہاتھ سے منکے کو اوپر اچھال رہی تھی - دیکھ رہی تھی - مسکرا رہی تھی - اور

ٹھمک ٹھمک کر کہہ رہی تھی۔ "اسے میں کتے کو پہناؤں گی۔ کتے کو پہناؤنگی —— اسے یہ بہت اچھا لگے گا۔"

"لاؤ! مجھے دو منکا"۔ کوشل اس کے قریب جا بیٹھا۔

جھنیا نے منکا کوشل کے ہاتھ میں دے دیا۔ اور مسکراتے ہوئے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

"انہیں بھی ضرور دکھاؤ"۔ پیچھے سے آواز آئی۔ لیکن کوشل اس طرف متوجہ نہیں ہوا۔ شاید اس نے یہ آواز سنی ہی نہیں۔ جھنیا سے بولا:۔

"اسے کتے کو پہناؤ گی؟ تم ہی پہن لو نا"۔

"میں کیوں پہن لوں۔ تم پہن لو"۔

"اچھا میں پہن لیتا ہوں۔ مانگو گی تو نہیں"؟

"نہیں مانگتی"۔

جس طرح گیند ایک بار اچھال دینے کے بعد کچھ دیر آپ ہی آپ اچھلتی رہتی ہے اسی طرح بات کہنے کے بعد جھنیا کا جسم اچھلنے لگتا تھا۔ اور وہ کافی دیر تک اچھلتا ہی رہتا تھا۔ اسے اچھلتا اور ہمکتا دیکھنے کے لئے ہی کوشل اپنی بات ذرا ذرا وقفہ کے بعد کہہ رہا تھا۔

"تمہارا نام کیا ہے"؟

وہ چپ رہی اور کوشل کی طرف یوں دیکھنے لگی۔ جیسے اسے

اپنا نام یاد ہی نہ ہو۔ کوشل نے سوچا تھا کہ وہ جھٹ کہے گی "کیوں بتاؤں"۔ اور اچھلنے لگے گی اچھلتی ہی رہے گی اور اس کے ساکن ہونے سے پہلے ہی وہ پھر کہے گا " تم نہ بتاؤ۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ تمہارا کیا نام ہے ——— جُھنیا!" اب وہ اور اچھلے گی۔ زیادہ زور سے اچھلیگی۔ اور بڑی دیر تک اچھلتی رہے گی۔ یعنی وہ اپنے تجویز شدہ نام کا اثر جُھنیا پر دیکھنا چاہتا تھا۔

لیکن پیچھے جھنیا کا خاوند اکڑوں بیٹھا تھا۔ نفرت اور غصّے کے مارے اس کے ہونٹ کانپ رہے تھے۔ اپنی بیوی کے پاس کوشل کا یوں آ بیٹھنا اور گھل مل کر باتیں کرنا اسے بہت ناگوار گذر رہا تھا۔ مذکورہ بالا سوال سن کر تو جیسے اس کی روح کا کوئی ٹانکا ہی کھل گیا ہو۔ اور وہ تنک کر بولا۔

"کیا مطلب ہے تمہارا یہ کیوں پوچھتے ہو اس کا نام؟"

"کوئی خاص مطلب نہیں۔ ویسے ہی پوچھ رہا تھا"۔ کوشل نے جواب دیا۔

"اچھا تو پھر ہم کہے دیتے ہیں کہ عورت سے بات کرنے کی کوئی ضرورت نہیں"۔

"حضرت آپ گرم کیوں ہوتے ہیں! میں اس سے کوئی عشق تو نہیں فرما رہا"۔ کوشل نے جواب دیا۔ اور اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ جھنیا کا خاوند محجوب سا ہو گیا۔ اس کی گردن جھک گئی اور وہ

زمین پر لکیریں کھینچتے ہوئے بولا :-

"میں آپ کو اکثر یہاں گھومتے ہوئے دیکھتا ہوں"۔

"گھومتا تو ٹھیک ہوں - اگر آپ حکم کریں - تو آئندہ نہ آیا کروں"

"آنے کو تو میں منع نہیں کرتا" جھنیا کے خاوند نے اسی طرح گردن جھکائے اور انگلی سے زمین پر لکیریں بناتے ہوئے کہا "لیکن عورت سے بات کرنے کا کوئی قاعدہ نہیں ہے - آپ کو کوئی بات پوچھنی ہو - تو وہ ہم سے پوچھئے"۔

"یونہی سہی - آپ ہی بتائیے - آپ کا نام کیا ہے"؟

اس نے اوپر نظر اٹھا کر دیکھا - اور ایک منٹ تک کوشل کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتا رہا -

پھر بولا - "میرا اصلی نام حامد علی ہے"۔

نام بتا کر حامد علی کا چہرہ قدرے سخت اور ٹھوس ہو گیا - اور آنکھیں پہلے سے زیادہ پھیل گئیں - کوشل کو یہ سب عجیب سا لگا - بولا :-

"اچھا اصلی نام تو سن لیا اور نقلی"؟

"نقلی کچھ نہیں - اصلی تو میں نے اس لئے کہا ہے کہ آپ سے جھوٹ نہیں بولا - ٹھیک کہا ہے - ادھر جتنے علاقے ہیں" - اس نے انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے کہا "کیا ہندو اور کیا مسلمان - میں ان سب میں گھومتا ہوں اور ہر علاقے کا تھانیدار مجھے جانتا ہے"۔

"وہ کیسے" ؟

"میں سب کے پاس جاتا ہوں - اور برتنوں پر قلعی کرتا ہوں"۔

"اچھا تو آپ قلعی گر ہیں" ؟

"ہاں، گلی محلے کے سب لوگ جانتے ہیں کہ میں قلعی گر ہوں"۔

"تو گویا سب قلعی گر کہتے ہیں - اور آپ کا اصلی نام حامد علی کوئی نہیں جانتا۔"

یہ ایک ایسی صداقت تھی جو اسکی اپنی زندگی سے تعلق رکھتی تھی - لیکن وہ خود بھی اسے جانتا نہیں تھا - شاید اسے نہ جاننا ہی اس کے لئے مفید تھا - آج سنا تو حیران و ششدر رہ گیا - اس کی گردن آپ ہی جھک گئی - اور وہ انگلی سے زمین پر لکیریں کھینچنے لگا۔

اسے اداس اور غمگین دیکھ کر کوشل کو بھی افسوس ہوا - اور وہ سوچنے لگا - کہ اس سماج نے انسان کو کتنا حقیر اور بے بساط بنا دیا ہے - وہ ذرا سی چوٹ بھی برداشت نہیں کر سکتا - اپنے بارے میں صداقت کو بھی نہیں جاننا چاہتا۔ آدمی جتنا حقیر اور مجبور ہوتا ہے - اتنا ہی شکوک میں الجھا رہتا ہے - شکوک بھی قدامت پسندی ہی کا ایک روپ ہیں - جو انسانی ارتقاء میں حائل رہتے ہیں۔

× × × × × ×

بائیں طرف جمال گھاس پر بیٹھا تھا - اور قریب ہی اس کے لیے

آپس میں کھیل رہے تھے۔ وہ دل ہی دل میں کچھ سوچ رہا تھا۔ اور داڑھی کھجلا رہا تھا۔ سوچتے سوچتے اور داڑھی کھجلاتے ہوئے وہ لیٹ گیا۔ اور بازو پیچھے کی طرف پھیلا کر گانے لگا ؎

خودی میں آکر خدا کو بھولا نہ تجھ سا کوئی نادان ہوگا
چلے گا جب تو جہاں سے تیرا اندھیرے گھر میں مکان ہوگا

وہ ان دو مصرعوں کو بار بار گا رہا تھا۔ اور خوش ہو رہا تھا۔ اس کا سر کبھی اونچا اور کبھی نیچا ہو جاتا تھا۔ اس میں دل کی کیفیت کے مطابق اتار چڑھاؤ پیدا ہو رہا تھا۔ رفتہ رفتہ اس پر خود رفتگی کی کیفیت طاری ہو گئی۔ وہ اپنے آپ میں کھو گیا۔ اور گانا بند کر کے دونوں ہاتھوں سے چٹکیاں بجانے لگا۔ کبھی کبھی وہ غیر مبہم سا گنگناتا اور ہنس دیتا تھا۔ اس کی روح سرور اور مستی سے مخمور معلوم ہوتی تھی۔

لیلے آپس میں کھیل رہے تھے۔ ایک دوسرے سے چھیڑ چھاڑ کر رہے تھے۔ ایک مرتبہ وہ کھیلتے کودتے لگ بھگ اس کے اوپر چڑھ گئے۔ لیکن جمال نے ان کی طرف کوئی دھیان نہیں دیا۔ انہیں آہستہ سے پرے دھکیل دیا۔ اس وقت وہ اس مادی دنیا میں نہیں تھا۔ شاید خودی کو بھلا کر خدا میں ڈوبا ہوا تھا۔

کوشل اسے دھوپ سینکتے اور گنگناتے چھوڑ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اور دل ہی دل میں کچھ سوچتا ہوا میدان میں گھومنے لگا۔ حسب دستور

بہت سے لوگ اِدھر اُدھر لیٹے پڑے تھے - ان میں سے بعض فقیر تھے - بعض جھلّی والے مزدور تھے - اور کہیں کہیں درمیانہ طبقہ کے لوگ بھی دکھائی دیتے تھے - جو کسی وجہ سے بے کار اور بے گھر ہو گئے تھے - اور اپنے مایوس اور دُکھی دل کو لئے یہاں آ لیٹتے تھے - ان کے جسم پر کچھ ثابت کپڑے تھے - جو دھیرے دھیرے پھٹتے جا رہے تھے - باقی سب لوگوں کے جسم قریباً ننگے تھے - کوئی چت اور کوئی اوندھا پڑا تھا - انہوں نے اپنے آپ کو اچھی طرح پھیلا رکھا تھا - تاکہ سُورج کی گرمی رات کے جاڑے میں سکڑے ہوئے اعضا کو گرما دے - ان میں منجمد خُون کو ایکبار پھر حرکت میں لائے - اور ان میں زندہ رہنے کی قوت بھر دے -

وہ بے حس و حرکت لیٹے ہوئے تھے - اور ان کے جسم میدان کی گھاس کی مانند سُورج کی کرنوں کو اپنے اندر جذب کر رہے تھے - سائنس والوں کا کہنا ہے کہ سُورج کی کرنیں انسانی جسم میں جذب ہو کر وٹامین میں تبدیل ہو جاتی ہیں - اور اسے زندگی بخشتی ہیں - یہ لوگ ہمیشہ کے ذاتی تجربے سے اس حقیقت کو سمجھتے تھے اور یہاں پریڈ گراؤنڈ میں لیٹ کر سورج کی کرنوں کو اپنی رُوح میں بھر لیتے تھے - قدیم انسان نے بھی سُورج کی زندگی بخش قوت کو سمجھ لیا تھا اور تبھی گائیتری منتر کی تخلیق ہوئی تھی -

ایک جگہ پر دو فقیر بیٹھے بارہ گیٹی کھیل رہے تھے - اُنہوں نے

دھرتی پر لکیریں کھینچ کر، اور اِدھر اُدھر سے کنکر جمع کر کے یہ کھیل جمایا تھا۔ اور سوچ سوچ کر نہایت اطمینان سے اپنی اپنی بازی کھیل رہے تھے۔ چہروں سے کسی طرح کا جوش یا روا روی نمایاں نہیں تھی۔ وہ مطمئن اور خاموش تھے۔ گھٹنوں پر بازو اور ہاتھوں پر سر رکھ کر پہلے خوب سوچتے تھے۔ پھر جو گیٹی "چلنی" ہوتی تھی۔ اُسے آہستہ آہستہ اٹھاتے تھے اور کھیل کو آگے بڑھاتے تھے۔

دونوں معمر تھے۔ ایک کے چہرے پر جھریاں تھیں اور چھدری سفید داڑھی تھی۔ آنکھوں کی روشنی گویا بجھ چکی تھی۔ لیکن ان سے تفکر کی پختگی اور اس سے پیدا ہونے والی ایک گونہ چمک نمایاں تھی۔ دوسرا آدمی اس سے ذرا کم عمر کا تھا۔ داڑھی وغیرہ کچھ نہیں تھی۔ چہرے کی کھال گو ڈھیلی ڈھالی اور سیاہی مائل تھی۔ لیکن ابھی جھریاں نہیں پڑی تھیں۔ وہ اپنی فکر کو پختہ بنانے کی کوشش کر رہا تھا۔

"اگر یہ چلو تو کیسا رہے؟ ان کی دو گیٹیاں پٹ جائیں گی!"

کوشل پہلے تو خاموش بیٹھا ان کی چال دیکھتا رہا۔ لیکن جب کھیل کو بخوبی سمجھ لیا۔ اور اس میں اس کی دلچسپی بڑھی۔ تو بنا داڑھی کے شخص کو اچانک یہ مشورہ دیا۔ دونوں آدمیوں میں سے کوئی بھی اس کی طرف متوجہ نہیں ہوا۔ اور ان کے چہروں پر بھی کسی تبدیلی اور کسی جذبہ کا اظہار نہیں ہوا۔ جیسے انہوں نے کوشل کی بات سنی ہی نہ ہو۔ جیسے اس کی موجودگی ہی سے بے خبر ہوں۔ وہ پریڈ گراؤنڈ میں بیٹھے

تھے۔ جو کسی کے باباکی جاگیر نہیں ہے اور وہ اپنی اپنی بازی خود کھیلنا چاہتے تھے۔ کوئی دوسرا اس میں کیوں دخل دے۔ انہیں کسی کا صلاح مشورہ درکار نہیں تھا۔

کوشل خفیف سا ہو گیا۔ اسے افسوس ہوا۔ کہ ناحق بات کہہ کر گنوائی چپ بیٹھے رہنے میں کیا ہرج تھا۔ دانائی بات کہنے میں نہیں بات سمجھنے میں ہوتی ہے۔

اب اس کے لئے کھیل میں دلچسپی لینا مشکل تھا اور یکایک اٹھ کر چلے جانا بھی مناسب نہیں تھا۔ وہ بے دل ہو کر دور کھجور کے درختوں کی طرف دیکھنے لگا۔ کھجور کے یہ درخت پریڈ گراؤنڈ سے پرے یادگار میں اُگے ہوئے تھے۔ ان کی چوٹیوں پر چند ہرے بھرے پتے تھے۔ لمبے لمبے تنے روکھے سوکھے اور ننگے دکھائی دیتے تھے۔ کوشل ان درختوں کے متعلق نہ سوچ کر ایسے ہی ایک دوسرے واقع کے متعلق سوچ رہا تھا۔

جب اس نے پہلے پہل جامن کے درخت کے نیچے جانا شروع کیا تھا۔ تو اسے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی تھی۔ کہ یہ لوگ جن کے پاس کافی کپڑے بھی نہیں ہیں۔ اس قدر کڑاکے کی سردی میں اس کھلے میدان میں جہاں جسم کو چیر دینے والی ٹھنڈی ہوا چلتی ہے۔ اندھیری لمبی راتیں بڑے اطمینان سے بسر کر لیتے ہیں۔ ایک دن اس نے امیر علی اور نورے کے ابّا سے باتوں ہی باتوں میں پوچھا۔

”آپ لوگ سردی گرمی سارا سال یہیں پڑے رہتے ہیں؟“

"اور کہاں جائیں۔ کوئی ٹھکانہ ہے؟"
"جب مینہ برستا ہے۔ تو کیا کرتے ہیں؟"
"کچھ لوگ جامع مسجد میں اور کچھ اس درگاہ میں چلے جاتے ہیں"۔
"لیکن آج کل تو سردی بہت ہے۔ اور آپ لوگوں کے پاس کپڑا بھی کافی نہیں ہے"۔

"کیا کریں۔ خداوند کریم آدمی کو جس حالت میں رکھتا ہے۔ اس میں رہنا پڑتا ہے"۔

اس ادھیڑ عمر آدمی —— نورے کے ابّا کی آنکھیں آسمان کی طرف اٹھ گئیں۔ ان میں قناعت اور توکّل کا ایک ٹھوس اور واضح جذبہ نمایاں تھا۔ جو بلاشبہ خدا کو قادرِ مطلق مان لینے کے روایتی عقیدہ سے پیدا ہوا تھا۔ کوشل نے اس عقیدت اور اس جذبے کو نہیں دیکھا۔ اس کا دل محتاجوں۔ بےکسوں اور اس نظام کے ذریعے کچلے جانے والے لوگوں کے لئے ہمدردی سے معمور تھا۔ اس ہمدردی کے باعث موجودہ سماجی نظام کے متعلق اس کے ذہن میں جو خیالات بھرے ہوئے تھے۔ انہیں ظاہر کرنے کے لئے وہ بےقرار ہو اٹھا۔ بولا:۔

"مگر آدمی کی یہ حالت خدا تو نہیں بناتا۔۔۔۔۔۔"

"خدا نہیں بناتا۔ تو اور کون بناتا ہے؟" اہیر علی نے بات کاٹی اور پورے اعتماد اور وثوق کے ساتھ صدیوں سے سینہ بسینہ چلی آرہی بات دوہرائی۔ "دنیا میں چھوٹے بڑے خدا نے بنائے ہیں۔ سب کو قسمت کا

لکھا ملتا ہے"!

"قسمت وسمت کوئی نہیں ہے"! کوشل نے بھی پورے اعتماد اور وثوق کے ساتھ کہنا شروع کیا"۔ آدمی چاہے تو اس قسمت کے لکھے کو بدل سکتا ہے۔ اور وہ بدل رہا ہے......"

"وہ دیکھو۔ سڑک پر فوجی گاڑیاں پھر جا رہی ہیں"!

نورے کے ابّا نے امیر علی سے کہا۔ اور وہ دونوں دُور سڑک کی طرف دیکھنے لگے۔ کوشل کا آخری جملہ فضا میں کھو گیا۔ کسی نے اسے نہیں سنا۔ کوئی اس کی طرف متوجہ نہیں تھا۔ امیر علی اور نورے کا ابّا سڑک پر سے گذرتی ہوئی فوجی گاڑیوں کو دیکھ رہے تھے۔

وسیع خلاؤں میں جھانکتے ہوئے کوشل کو یہ واقعہ اکثر یاد آجاتا ہے۔ اپنے تئیں ایک ٹھوس اور اہم مسئلہ بنا کر پیش کرتا ہے اور وہ سوچنے لگتا ہے کہ جب تک اس دُنیا میں انسان کی حالت کو بہتر اور خوشحال بنانے کے مادی وسائل مہیّا نہ کر دئے جائیں۔ عدم۔ خدا اور خدا سے متعلق بے شمار توہمات اس کے تخیل سے چپٹے رہیں گے۔ ان ظالم اور بے رحم حالات میں وہ باتوں کے عوض اپنے ماضی کے روحانی سرمایہ کو کبھی ترک نہیں کرے گا۔ وہ جتنا ہی اس مسئلہ پر اس پہلو سے غور کرتا ہے۔ اتنا ہی اس کی فکر میں متانت اور پختگی کا اضافہ ہوتا ہے۔ اور اس کا مادیت کا تصوّر خیالی نہ رہ کر حقیقی اور دُنیاوی بنتا جاتا ہے۔ اور اس کا احساس ہوا میں اڑتے رہنا چھوڑ کر آہستہ آہستہ

ٹھوس زمین پر چلنے لگتا ہے۔ اسے اپنی ہستی پریڈ گراونڈ کی وسعتوں میں پھیلتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ اور اس پر اس صداقت کا اظہار ہوتا ہے کہ آدمی اگر حساس ہو۔ تو اس کی بھول اس کا سبق بن جاتی ہے۔

(۱۲)

کوشل جتنا ان لوگوں کے قریب آرہا تھا اتنا ہی اپنے اندر تبدیلی محسوس کر رہا تھا۔ جہاں کہیں دو چار آدمیوں کو اکٹھے دیکھتا۔ ان کے نزدیک جا بیٹھتا۔ وہ جو باتیں کرتے خاموشی سے سنتا رہتا۔ ان باتوں کی روشنی میں ان کی شخصیتوں، کرداروں اور خواہشوں کا اندازہ لگاتا اور روح کی گہرائیوں میں اتر جانے کی کوشش کرتا۔ لیکن ان کی کسی بات کی تردید کرنے کے سلسلے میں ہمیشہ محتاط رہتا۔ البتہ اگر گفتگو کا موضوع اپنے خیالات کے مطابق ہوتا۔ اور اس میں کوئی ارتقاء پذیر سماجی یا تاریخی عنصر موجود ہوتا۔ تو تائید ضرور کر دیتا۔ اور کبھی کبھی ایک آدھ فقرہ ایسا کہہ دیتا۔ جس سے گفتگو کو آگے بڑھانے میں مناسب سمت مل سکے۔

پریڈ گراونڈ میں بعض لوگ ایسے بھی ملے تھے۔ جنہیں صرف چند منٹ کے لئے ایک مرتبہ دیکھا تھا۔ اور دوبارہ ملاقات نہیں ہو سکی تھی۔ دراصل وہ رمتے جوگی تھے۔ جو یونہی گھومتے گھامتے ادھر آنکلتے تھے اور ایک

آدھ دن یا دو چار گھنٹے اس میدان کو اپنی آرام گاہ بنا کر "پائے گدا لنگ نیست" کا ورد کرتے ہوئے چل دیتے ہیں۔ جس طرح بعض سیارے سینکڑوں ہزاروں سال کی گردش میں ایک دفعہ جس منزل سے گذر گئے۔ اس کا طواف دوبارہ کریں۔ کریں اور نہ کریں تو نہ بھی کریں۔ اسی طرح یہ آوارگانِ قوم و ملت دوبارہ ادھر آئیں۔ آئیں اور نہ آئیں تو نہ بھی آئیں۔

لیکن وہ مختصر سی ملاقات ہی میں کوشل کے ذہن پر اپنی شخصیت کے دوامی نقش چھوڑ گئے تھے۔ ان کی صورتیں تصور میں منقسم ہو کر رہ گئی تھیں۔ ان کی باتوں میں کچھ ایسی شگفتگی۔ تازگی اور گرمی ہوتی تھی۔ کہ شکل یاد آتے ہی وہ باتیں بھی ٹھوس اور مجسم ہو کر نگاہوں کے سامنے رقص کرنے لگتی تھیں۔ ان کی خاموشیاں بھی پر معنی اور لذت افروز ہوتی تھیں۔

جس جگہ یہ دونوں آدمی "بارہ گیٹی" کھیل رہے تھے اسی جگہ اُس دن ایک فقیر بیٹھا تھا۔ جس کی آنکھیں بڑی بڑی اور چمک دار تھیں۔ سر پر لمبے لمبے بال تھے۔ اور وہ چوڑی بہت ہی چوڑی آستینوں والا جوگئے رنگ کا کرتہ پہنے ہوئے تھا۔ گلے میں موٹے موٹے دانوں کی مالا اور بٹے ہوئے کالے دھاگے پہن رکھے تھے۔ قریب ہی ترشول اور جھولی پڑی ہوئی تھی۔ اس نے ایک ٹانگ آدھی پھیلا رکھی تھی۔ جس کے انگوٹھے میں ایک دھاگا پھنسا کر اس کا ایک سرا دانتوں میں دبا

رکھا تھا۔ اور دوسرے سرے کو وہ دونوں ہاتھوں سے بٹا دے رہا تھا۔ وہ دھاگے کو بٹا دے کر اس میں گانٹھیں لگنے لگا۔ ایک اور آدمی اُسے بڑی عقیدت اور غور سے دیکھ رہا تھا۔ شاید وہ اس کا مرید تھا۔ اور اس کی کوئی تمنّا پوری کرنے کے لئے ہی یہ دھاگا تیار کیا جا رہا تھا۔ کوشل پہلے تو دور کھڑا دیکھتا رہا۔ لیکن جب دھاگا بٹ کر تیار ہو گیا۔ پھر اس خیال سے کہ اب اس کے متعلق باتیں ہونگی۔۔ وہ ان کے نزدیک چلا گیا۔

"کیا میں بیٹھ سکتا ہوں"؟ کوشل پہلے اس کی جھولی کے قریب بیٹھ گیا اور پھر دریافت کیا۔

"بڑے شوق سے"۔ فقیر بولا۔ اور کہا "میدان پڑا ہے۔ یہ ہمارے بابا کی جاگیر تھوڑی ہی ہے"!

"تو آپ جاگیر بنانے کی بھی تمنّا رکھتے ہیں"؟ فقیر نے اپنی بات کچھ ایسے مزاحیہ انداز میں کہی تھی۔ کہ کوشل کے دل میں یہ سوال کرنے کی تحریک خود بخود پیدا ہو گئی۔

"ہم جاگیر کس لئے بنائیں گے؟ آج یہاں کل وہاں۔ ساری دُنیا ہماری ہے"!

اس نے بے پروائی سے کہا۔ اور آنکھوں کو یوں وا کیا۔ گویا ان میں واقعی دنیا کی وسعت بھری ہوئی ہو۔

کوشل پریڈ گراؤنڈ کے خاموش ماحول میں بیٹھا ہوا کئی بار سوچا

کرتا تھا۔ کہ اس کی وہ آنکھیں اور یہ بات کیوں اکثر یاد ہو آتی ہے۔ دیکھا جائے تو بظاہر یہ فقرہ مجذوب کی جڑ سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔ اس میں کوئی جدت بھی نہیں ہے۔ بعض اوقات ایسے ہی معمولی فقرے انسان کی روح کا آئینہ بن جاتے ہیں۔ اور چونکہ ان پر انسانی روح کی چھاپ رہتی ہے۔ اس لئے وہ فراموش نہیں ہوتے۔

اور وہ لمبا سا آدمی جس کی شکل کچھ عجیب اور دلچسپ معلوم ہوتی تھی۔ شاید سر بڑا ہونے کی وجہ سے کان ذرا چھوٹے نظر آتے تھے۔ وہ فقیر نہیں تھا۔ یونہی آوارہ گھومتا تھا۔ سر اور داڑھی کے بال سفید نہیں تھے۔ لیکن بہت معمر معلوم ہوتا تھا۔ جیسے بڑھاپے اور موت کو چکمہ دینے کے لئے ہی وہ گھومتا پھرتا ہو۔ اور صدیوں سے جی رہا ہو۔ دہلی سے وہ یوں واقف تھا۔ جیسے اسے بار بار بستے اور اجڑتے دیکھ چکا ہو۔ کوشل کو اپنے نزدیک بٹھا کر اور اسے اپنا ہم مذہب سمجھ کر بولا:۔

"یہ وہی دہلی ہے جہاں میں نے مسلمانوں کو راج کرتے دیکھا ہے۔ جہاں چاہتے تھے دندناتے پھرتے تھے۔ کسی کی مجال نہیں تھی کہ ذرا ٹوک تو دے۔ مگر آج یہ حالت ہے کہ پہاڑ گنج۔ قرول باغ اور سبزی منڈی کا رُخ کرنا موت کے منہ میں جانے کا قصد کرنا ہے۔ یہاں جامع مسجد پر بیٹھے دم گھٹتا ہے۔ اس لئے میں کہتا ہوں۔ کہ پاکستان لیا نہیں ہمیں دیا گیا ہے۔ ہم نے پاکستان حاصل کر کے کچھ پایا نہیں

کھویا ہے۔"

"یہ آپ بجا فرما رہے ہیں"۔ کوشل بولا۔

"سوچئے تو سہی۔ اب ہماری حیثیت کیا ہے۔ ہماری تو چھوڑیئے۔ جو پاکستان گئے ہیں انہیں کون سا آرام مل گیا۔ بہتیرے بیزار ہو کر لوٹ رہے ہیں"۔

"اور جو وہاں رہیں گے۔ کیا ان کا رشتہ تاج محل اور جامع مسجد سے ٹوٹ جائے گا؟"

اس نے سر ہلایا۔ جیسے کہہ رہا ہو۔ یہ نہیں ہو سکتا اور جو ہو گیا ہے۔ وہ بھی ایسے نہیں رہ سکتا۔ اس کا سر دو تین منٹ تک ہلتا رہا۔ اور پھر یوں ساکت ہو گیا۔ جیسے وہ کاٹھ کا بنا ہوا ہو۔ جیسے اس نے اپنے تمام حواس کو اندر کھینچ لیا ہو۔ وہ کچھ دیر چپ رہا۔ اور پھر بولا:۔

"یہ سب انگریز کی سازش ہے۔ اگر وہ یہ سازش نہ کرتا۔ تو وہی کچھ ہوتا جو غدر میں ہوا تھا۔ غدر میں تو وہ بچ بھی گیا تھا۔ لیکن اب اس کا بچ جانا ممکن نہیں تھا"۔

وہ چپ ہو گیا۔ چہرے پر سنجیدگی اور سکون چھایا تھا۔ وہ پھر حواس کو اندر کی طرف کھینچنے کی کوشش کرنے لگا۔ لیکن اس مرتبہ اسے پہلے کی طرح کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا۔ جیسے اس کے اندر غصہ کھول رہا ہو۔ لیکن اس نے غصہ کو اپنی حدود میں رہنے

کی تربیت دے رکھی ہو۔

کوئی شخص دیکھنے میں کتنا ہی معمولی اور حقیر کیوں نہ ہو۔ وہ انسان ہے۔ اس میں انسانیت اور عظمت موجود رہتی ہے۔ جو وقتاً فوقتاً بیدار ہو جاتی ہے اور اپنے تئیں فعل یا قول کے ذریعہ ظاہر کرتی ہے۔ اسی انسانیت اور عظمت کے باعث ہر فرد غلامی اور غریبی سے نفرت کرتا ہے اس کے خلاف غصّے کا اظہار کرتا ہے۔ جامن کے پیڑ تلے بسنے والے فقیر بھی جو سماج کے ٹھکرائے ہوئے لوگ ہیں۔ اور جن کا اس مادی دنیا کے ساتھ بہت ہی معمولی تعلق رہ گیا ہے۔ کبھی کبھی ملک کے موجودہ حالات اور سیاسیات پر تبصرہ کیا کرتے ہیں تو ان کی باتوں سے بھی اس تربیت یافتہ غصّے کا اظہار ہوتا ہے۔

صبح نو دس بجے کا وقت تھا۔ کوشل گھومتا ہوا ادھر آ نکلا۔ گڑیا بیٹھی سنگھار پٹی کر رہی تھی۔ مریم نے چائے بنائی تھی اور پینے کی تیاری ہو رہی تھی۔ ایک پیالے میں آٹا پڑا تھا۔ اسے خالی کرنے کے لئے مریم نے ٹین کا ایک ڈبہ نکالا۔ اور اسے اندر سے دیکھنے لگی۔

"آٹا خشک ہے۔ ڈال دے اسی میں ڈال دے۔"

جب وہ ڈبے میں جھانک رہی تھی۔ تو نورے نے بڑی شدّومد سے کہا۔ اور ایک لکڑی اٹھا کر اس سے زمین پیٹنے لگا۔ پیالہ اُسی کے لئے خالی ہو رہا تھا۔ اور وہ چاہتا تھا۔ کہ چائے اُسے جلدی مل جائے۔

"آؤ بابو! چائے پی رہے ہیں۔ ہمارا دن اب نکلا ہے"۔ نورے کے ابّا نے کوشل سے کہا۔

"یہ تو امیروں کے چونچلے ہیں کہ صبح اُٹھتے ہی ناشتہ مل گیا۔ غریب کو تو جب مل جائے تبھی غنیمت ہے"۔ امیر علی بولا۔ اس نے کوٹ پہن رکھا تھا۔ کوٹ میں پھول لگا ہوا تھا۔ اور سر پہ انگوچھا بندھا ہوا تھا۔

"سنا ہو گا" کوشل بولا۔ "کسی نے حکیم سے پوچھا۔ کھانا کس وقت کھانا چاہیئے۔ حکیم بولا۔ امیر کو جب بھوک لگے۔ اور غریب کو جب ملے"۔

"یہ کھیل تماشے۔ میلے ٹھیلے اور تہوار سب امیروں کے لئے ہیں۔ سدا میلہ امیر کا اور سدا محرم . . . . نورے کے ابّا نے کہا لیکن فقرہ پورا ہونے سے پہلے ہی امیر علی نے اس کے منہ کی بات چھین لی۔ چائے کا گرم گھونٹ اندر جاتے ہی اس کا خون حرکت میں آیا اور وہ امنگ میں بھر کر بولا۔

"خواجہ تیرا میلہ نکلا جائے"۔ تبھی تو کہا ہے۔

"میلا (بمعنی غلاظت)" مریم نے منہ لگاڑ کر کہا۔

"میلا نہیں۔ میلہ"۔ امیر علی نے تصحیح کرنا چاہی۔ لیکن وہ جان بوجھ کر کہہ رہی تھی۔ اس لئے منہ بنا کر اور ایک ایک حرف پر زور دے کر پھر کہا:۔

"نہیں مَیلا!"

اس نے کپڑے میں لپٹی ہوئی دو باسی روٹیاں نکالیں - اور ان کے ٹکڑے بنا کر سب میں تقسیم کر دیں۔ نورے نے اپنے حصے کے ٹکڑے کو جلدی جلدی دانت سے کاٹا اور بھرا ہوا منہ اُوپر کو اٹھا کر "چپ چپ" کرنے لگا - اس کی آنکھیں ڈھیڈ سے بھری ہوئی تھیں - اس نے صبح اٹھ کر انہیں پانی سے نہیں دھویا تھا - پھر وہ کُتّے کو کھانے میں شریک ہونے کی دعوت دینے لگا - کُتا دم ہلاتا ہوا پاس آ بیٹھا - اور نورے نے ایک لقمہ توڑ کر اس کے آگے ڈال دیا -

"ہم فقیر ہیں - اپنے من کی کرتے ہیں"- نورے کے ابّا نے کہا - ایک لقمہ نگل کر اور چائے کا گھونٹ پی کر پھر بولا "پر فقیر فضول نہیں ہوتے - ان میں بھی کچھ کرامات ہوتی ہے - کون کہنے جاتا ہے کسی سے کہ تم آؤ - میرے سامنے سر جھکاؤ - فقیر کسی کو بلانے نہیں جاتا - اسے کسی سے کوئی غرض نہیں ہے - جب مصیبت آتی ہے تو لوگ خود بھاگے آتے ہیں - ورنہ خدا پر توکّل رکھو - خدا کے حکم کے بغیر تو پیر بھی کچھ نہیں کر سکتا!"

اس نے یکے بعد دیگرے روٹی کے کئی لقمے توڑے اور انہیں مُنہ میں ڈال کر نگل گیا - اور پھر اُوپر سے چائے انڈیل کر انہیں گلے سے نیچے اتارا - اس کے بعد اطمینان کی سانس لی - اس کی آنکھوں میں ذہانت کی چمک پیدا ہوئی - اور بولا:-

"میں یہ بہت باریک باتیں کر رہا ہوں جنہیں سمجھنے کے لئے

عقل چاہیے۔ دماغ چاہیے۔ مگر لوگ سوچتے ہیں۔ کہ فقیر بک رہا ہے۔ پاگل ہے۔ ٹٹ پونجیا ہے۔ فقیر ٹٹ پونجیا نہیں ہے۔ میں نے دنیا دیکھ رکھی ہے۔ زمانے کے ہیر پھیر۔ اونچ نیچ سب جانتا ہوں۔ دیکھئے انگریز بہادر ہے۔ اِس لیئے اس نے آٹھ سو سال تک راج کیا اور اب بھی کر رہا ہے۔ میں سچ کہتا ہوں کہ اب بھی اس کا حکم چلتا ہے۔ اسے خود یہاں آنے کی ضرورت نہیں۔ کام ہمارے دیسی آدمی کرتے ہیں۔ ایسے جو کچھ کرانا ہوتا ہے۔ وہیں سے کہلا بھیجتا ہے۔ آج بھی ایک گورا یہاں پریڈ گراؤنڈ میں آ کر کھڑا ہو جائے۔ تو کسی کی ہمّت نہیں کہ اس کے سامنے دم تو سمالے"۔

وہ یہ تمام باتیں ایک ہی سانس میں کہہ گیا۔ اس کی آواز میں کسی طرح کا اتار چڑھاؤ پیدا نہیں ہوا۔ وہ اکڑوں بیٹھا تھا۔ باہیں گھٹنوں کے گرد حمائل تھیں۔ جب بولتا تھا۔ تو داڑھی ہلتی تھی اور بالوں میں اٹکے ہوئے ردی کے دو ننھے ننھے ٹکڑے ہلتے تھے۔ اس نے ناشتے سے نپٹ کر داڑھی پر ہاتھ نہیں پھیرا۔ جس سے چائے کے چند قطرے بھی اس میں جذب ہو گئے تھے۔ اسی بے پروائی کے باعث داڑھی الجھ گئی تھی۔ اور بالوں کا رنگ بھی قدرے مٹ میلا ہو گیا تھا۔ آنکھوں کا رنگ بھی مٹ میلا تھا۔ اس لیئے ان میں پیدا ہونے والے جذبات کا اندازہ لگانا ممکن نہیں تھا۔ اس نے دایاں ہاتھ اوپر اٹھایا اور انگلی ہلاتے ہوئے کہنا شروع کیا۔

"یہ جامع مسجد، یہ لال قلعہ اور وہ آگرہ کا تاج محل اسلام کی ناک ہیں - انہیں کی بدولت مسلمان زندہ ہیں - یہ نہ ہوتے تو آج ہندوستان میں ایک بھی مسلمان موجود نہ ہوتا!"

"کوئی مائی کا لال ہو - تو بنا دے ایسی مسجد - نانی یاد آجائے گی - کوئی آسان کام نہیں ہے - انگریز بھی نہیں بنا سکا!" امیر علی چھاتی ٹھونک کر بولا -

"لکھ پتی اور کروڑ پتی ترستے رہ جاتے ہیں - انہیں جامع مسجد کو دیکھنا تک نصیب نہیں ہوتا!"

نورے کے ابّا کی مٹ میلی آنکھوں میں فخر اور خود اعتمادی چمک اٹھی تھی -

اور ایک روز جب کوشل کا گذر ادھر سے ہؤا - تو جمال اور عبدالصمد آپس میں باتیں کر رہے تھے -

عبدالصمد بولا "اِدھر اور اُدھر دونوں طرف یہی کچھ ہو رہا ہے - خدا کی قسم - دُنیا پر شیطان کی حکومت ہے!"

کوشل نے صرف آخری فقرہ یعنی دنیا پر شیطان کی حکومت ہے صاف طور پر سنا تھا - وہ جاننا چاہتا تھا - کہ یہ الفاظ کس سلسلے میں کہے گئے ہیں - بولا -

"کیا بات ہے جمال؟ کون ہے شیطان؟"

"بابو جی! ہندو اور مسلمان دونوں میں شیطان بھرے پڑے

ہیں۔ جس کے اعمال بُرے ہیں وُہی شیطان ہے"۔ جمال نے جواب دیا۔

سرد ہوا چل رہی تھی۔ اس لئے اس نے کنٹوپ پہن رکھا تھا۔ اور اپنے لیلوں کو بھی کپڑے اوڑھا رکھے تھے۔ وہ ایک کو بائیں بازو میں اور دوسرے کو دائیں میں دبائے بیٹھا تھا۔ وہ بھی چپ چاپ پڑے تھے۔ شاید شیطانیت سے متعلق اس کا فلسفہ سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس نے بیڑی کا کش لگا کر پھر کہا۔

"یہ حیدر آباد کا نظام سب سے بڑا شیطان ہے۔ اس نے ہمیشہ غداری کی ہے۔ جب مسلمانوں کا راج آیا۔ تو اس کے ایک ایک بچے کو زندہ گڑوا دیا جائے گا۔ یہ وہی نظام ہے جس نے ہمارے سُلطان ٹیپو کو مروایا تھا۔ ورنہ ٹیپو انگریزوں کے قبضے میں کبھی نہ آتا"۔

کوشل نے اس کی طرف دیکھا اور سوچنے لگا۔ اور دُوسرے ہی لمحہ اس کے ذہن میں یہ خیال پیدا ہوا۔ کہ راکھ کے ڈھیر کے نیچے بھی چنگاریاں چھپی رہتی ہیں۔

حیدر آباد پر ہندوستانی حکومت کی فوج کشی اور قبضے کی داستان ابھی نئی اور تازہ تھی۔ کل ہی ایک اخبار نے اس سلسلہ میں تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا۔ کہ نظام کی سرکار نے پہلے ہی سے بھارت سرکار کے ساتھ سانٹھ گانٹھ کر رکھی تھی۔ مقابلہ تو محض ایک ڈھونگ تھا۔ دنیا کی آنکھوں

میں دھول جھونکنے کی کوشش تھی۔ ورنہ وہ خود گستاخ رضا کاروں کی طاقت کو توڑنا چاہتا تھا۔ اور کمیونسٹوں کی بڑھتی ہوئی طاقت سے خوفزدہ تھا۔

جمال بہت ہی دلچسپ آدمی تھا۔ ہر وقت شہزادے اور شہزادی سے کھیلتا رہتا تھا۔ کبھی دانے اور کبھی گھاس کھلایا کرتا تھا۔ وہ جتنا ان کا خیال رکھتا تھا اور جتنی تندہی سے ان کی پرورش کرتا تھا۔ شاید اتنی کبھی رشید کی بھی نہیں کی تھی۔ جب ان سے فرصت ملتی تھی تو وہ خود کو بھلا کر خدا میں ڈوب جاتا اور مست ہو کر گایا کرتا تھا دُنیا اور اس کے دھندوں سے یکسر بے نیاز معلوم ہوتا تھا۔ کوشل نے آج اپنی آنکھوں دیکھ لیا۔ کہ یہ روحانیت اور بے نیازی شکست خوردہ اور خوف زدہ روح کے لئے ایک مصنوعی خول ہے بعض اوقات اس خول کو توڑ کر پاک اور خالص انسان باہر نکل آتا ہے۔ اور اپنے آپ کو صحت مند بنائے رکھنے کے لئے کھلی فضا میں سانس لیتا ہے۔

(۱۳)

بہت دن گذر گئے۔ ابراہیم سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ دراصل کوشل اب اس سے ملنا چنداں ضروری بھی نہیں سمجھتا تھا۔ وہ جب ملتا۔ وہی پُرانی ہانکیں دہرایا کرتا۔" وہ دیکھو۔ فلاں فقیر بھٹکتا ہوا ادھر آ

نکلا تھا۔ میں نے اسے اپنے پاس سُلایا۔ کھانا کھلایا۔ یہ میرا ہی دم ہے کہ کوئی بھوکا نہیں رہنے پاتا۔ یہ سب لوگ نکمے ہیں۔ ان فقیرنیوں کا کیا ہے۔ آج اس کے پاس بیٹھی ہیں۔ کل اس کے پاس جا بیٹھیں گی"۔ اب اچانک اس سے ملاقات ہو گئی۔ وہ کسی کام سے بازار جا رہا تھا۔ اس نے کوشل کا خیر مقدم کیا۔ اور ہاتھ ملاتے ہوئے بولا۔

"شام کو ملئے گا؟ ہم آپ کو ایک ضروری بات بتائیں گے"۔

کوشل نے آنے کا وعدہ کیا۔ اور ان مزدوروں کو دیکھنے لگا۔ جو میدان کے مشرقی کونے پر مٹی کھود رہے تھے۔ ان کی تعداد پندرہ بیس ہو گی۔ دو تین عورتیں اور باقی سب مرد تھے۔ کچھ مٹی کھود رہے تھے۔ اور کچھ ٹوکروں میں بھر بھر کر اسے اٹھا رہے تھے۔ اور ایک دوسری جگہ پر ڈھیر لگا رہے تھے۔ ایک بابو قسم کا آدمی ان کی نگرانی کر رہا تھا۔ اس سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا۔ کہ یہاں سرکس کا کھیل ہو گا۔ اور اس کے لئے یہ جگہ کرایہ پر لی گئی ہے۔

"آپ یہ مٹی وہاں ڈھیر کرنے کے بجائے اس گڑھے میں کیوں نہیں بھر دیتے؟ تاکہ زمین ہموار ہو جائے"۔

"ہمیں تو جو حکم ملا ہے۔ وہی کریں گے۔ انہوں نے ہم سے کہا ہے کہ جتنی مٹی کھودو۔ واپس اس جگہ پر ڈال دینا"۔

اس جگہ سے میدان کافی اونچا تھا۔ اور ذرا دو تین گز پرے ایک ڈھلوان تھا۔ گڑھا بنا ہوا تھا۔ اگر مٹی دوبارہ یہاں ڈالنے کے بجائے

اس گڑھے میں بھر دی جاتی - تو اس سے زمین ہموار ہو جاتی اور وہ بارہ مٹی اٹھانے کی محنت بھی نہ کرنی پڑتی - لیکن حکومت کے کارندے معمولی معمولی تبدیلیوں سے بھی ڈرتے ہیں - اور جو چیز جس حالت میں ان کے سپرد کی جاتی ہے - اسے ویسا ہی رہنے دیتے ہیں عقل سے کام لینا گناہ سمجھا جاتا ہے - اور یہی شاید سب سے بڑی وفاداری اور نمک حلالی ہے -

زمین پکّی اور سخت تھی - گھاس کی جڑیں دُور دُور تک پھیلی ہوئی تھیں - اور انھوں نے مٹی کو اپنی گرفت میں اِتنی مضبوطی سے جکڑ رکھا تھا کہ اسے سیمنٹ سے بھی زیادہ مضبوط بنا دیا تھا کوشل کے نزدیک جو مزدُور زمین کھود رہا تھا - اسے بہت زیادہ زور لگانا پڑ رہا تھا گینتی گھاس کی جڑوں میں الجھ الجھ کر رہ جاتی تھی - یا کسی اینٹ پتھر سے ٹکرا کر رہ جاتی تھی - جس طرح پُرانی روایات اور توہمات کی جڑیں...... ...... سماج کے ارتقاء میں رکاوٹ بنی رہتی ہیں اسی طرح یہ گھاس اور اینٹ پتھر کھدائی کے کام میں رکاوٹ بنے ہوتے تھے - مگر نوجوان مزدُور کی مسلسل چوٹیں تمام اڑچنوں کو دُور ہٹا رہی تھیں - وہ خود پسینہ پسینہ ہو گیا تھا - لیکن اس نے منوں مٹی کھود ڈالی تھی - ابھی اور کھود رہا تھا - کوشل اس کی گینتی کو رکاوٹوں سے ٹکراتے اور انہیں توڑتے دیکھ رہا تھا - سبھی مزدور اپنے کام میں تندہی سے مصروف تھے - کچھ مٹی کھود رہے تھے - کچھ ٹوکروں میں بھر رہے تھے - اور کچھ اٹھا اٹھا

کرنے جا رہے تھے۔

"دیکھو تم یُوں وقت کا ہرج کرتے ہو۔"

مٹی ٹوکروں میں بھرنے والے ایک مزدور کے پھاوڑے سے دستہ نکل گیا تھا۔ اور وہ اسے درست کرنے بیٹھ گیا تھا۔ سرکس کمپنی کا منشی لپک کر اس کے پاس آیا۔ اور جلدی جلدی دستہ ڈالنے کی ہدایت کرنے لگا۔ تاکہ وقت ضائع نہ ہو۔

کوشل دس پندرہ منٹ تک یہاں کھڑا مزدوروں کو محنت کرتے اور زمین کھودتے دیکھتا رہا۔ جب وہ چلنے لگا۔ تو ایک آدمی نے اس سے پُوچھا۔ اس کی طرح کچھ اور لوگ بھی وہاں جمع ہو گئے تھے۔

"یہاں کیا ہو گا؟"

"سرکس آئے گا۔"

"سرکس کوئی تماشا ہوتا ہے؟"

"ہاں! کبھی دیکھا نہیں تم نے۔ گھوڑے ہوتے ہیں۔ ہاتھی ہوتے ہیں اور شیر ناچتے ہیں۔"

"نہیں۔ کبھی نہیں دیکھا۔ یہ ٹکٹ لیتے ہونگے؟"

"ہاں ٹکٹ تو ضرور لیں گے۔"

وہ آدمی کچھ بولا نہیں۔ گھوڑے ہاتھی اور شیروں کے ناچ کی بات سُن کر اس کے دل میں تماشا دیکھنے کا اشتیاق پیدا ہُوا تھا۔ آنکھوں میں جو چمک آ گئی تھی۔ وہ اب یک بیک بجھ گئی۔ وہ ستائیس

اٹھائیس برس کا گٹھیلے جسم کا تندرست آدمی تھا۔ اس کے ہاتھ پاؤں ٹانگوں اور باہوں پر سیاہی پتی ہوئی تھی۔ اُس نے گھٹنوں تک جو تہمد باندھ رکھا تھا۔ وہ بھی سیاہ تھا۔ سر پر بندھا ہوا انگوچھا بھی سیاہ تھا۔ جسم کے جو حصے ان کپڑوں سے باہر نظر آ رہے تھے وہ سب سیاہ تھے۔ لیکن غور سے دیکھا جائے۔ تو اس کا رنگ سیاہ نہیں تھا بلکہ گورا تھا۔

"کوئلے کی دکان پر کام کرتے ہو؟"

"ہاں"

"رہتے کہاں ہو؟"

"وہیں پڑ رہتا ہوں۔ گھر میرٹھ میں ہیں۔ یہاں مزدوری کرنے آیا ہوں"۔ "مزدوری کیا ملتی ہے؟"

"گاہکوں کے کوئلے اٹھا کر ان کے گھر چھوڑ آتا ہوں۔ وہ جو دے دیتے ہیں۔ وُہی ملتا ہے"

"اور دوکان کا کام مفت کرتے ہو؟"

"جی ہاں!"

اس نے جواب دیا اور کچھ زیادہ کہتے کہتے رک گیا۔ وہ جب بات نہیں کرتا تھا۔ ہونٹ تب بھی کھُلے رہتے تھے۔ وہ اب بھی کھلے ہوئے تھے اور اسی وجہ سے وہ بہت ہی سادہ لوح معلوم ہو رہا تھا۔

شام کو چار بجے جب کوشل ابراہیم سے ملنے آیا۔ تو نرگس کے

لئے زمین کھودنے کی تجویز مسترد ہو چکی تھی۔ کمپنی کے مالک یا کسی دوسرے با اختیار آدمی نے آکر موقع دیکھا۔ تو اس نے میدان کے مغربی کونے میں سرکس لگانا پسند کیا۔ وہاں زمین کچی تو تھی۔ لیکن ہموار تھی۔ اس طرح مزدوری اور وقت دونوں کی بچت ہوتی تھی۔ سرکس غازی آباد سے آرہا تھا۔ وہاں اب ایک بھی دن ٹھہرنے کی گنجائش نہیں تھی۔ کیونکہ کمپنی آمدنی کے بغیر خرچ برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ اس ہموار جگہ پر انتظام جلدی ہو سکتا تھا۔ اور وہ ہونے لگا۔

ابراہیم نور اللہ شاہ کی قبر کے نزدیک بیٹھا کسی آدمی سے باتیں کر رہا تھا۔ کوشل کے وہاں پہنچتے ہی وہ آدمی چلا گیا۔ اور ابراہیم کوشل سے رجوع ہوا۔

"کہو کیا بات بتانا چاہتے تھے؟" کوشل بولا۔

"ہمارا ایسا خیال ہے کہ تم جو کام کرنا چاہتے ہو۔ اس میں تم کامیاب ہو جاؤ گے"۔ گردن کو قدرے دائیں جانب جھکا کر ابراہیم نے خلاء میں جھانکتے ہوئے کہا۔

"کونسا کام؟"

"جو کچھ بھی تم کرنا چاہتے ہو"۔

"ہم تو انقلاب چاہتے ہیں"۔

"بس ہو جائے گا۔ سمجھ لو۔ فقیر کی دعا ہے"۔

کوشل اس کی طرف دیکھنے لگا۔ دیکھتا رہا۔ سے ابراہیم کے چہرے

پر خود اعتمادی کی جگہ خوشامد کی جھلک نظر آتی ۔ وہ اتنا بھی نہیں سمجھتا تھا کہ انقلاب کا مطلب کیا ہے ۔ اور اگر سمجھانے کی کوشش بھی کی جائے ۔ تو بھی نہیں سمجھ سکتا ۔ اسے صرف دعا دینے سے غرض تھی ۔ اور وہ اس نے بڑی فیاضی سے دے دی ۔ اُسے کیا معلوم کہ انقلاب نہ کبھی دعاؤں سے آتے ہیں اور نہ رکتے ہیں ۔

"کیا تمہیں پیر صاحب نے بتایا ہے؟" کوشل نے دریافت کیا ۔

"ہاں اسے پیر صاحب کا ہی کہا سمجھو ۔ آج جمعرات ہے نا ۔ ہر جمعرات کی شب کو وہ مجھے ضرور خواب میں دکھائی دیتے ہیں اور میں کوئی بھی ایک بات پوچھ لوں ۔ اس کا جواب دیا کرتے ہیں ۔ میں نے ان سے پوچھا ۔ کہ یہ بابوجی جو کچھ دنوں سے ادھر آرہے ہیں کیا ان کا کام بن جائیگا؟ انہوں نے جواب دیا کہ ہاں! وہ جلدی ہی کامیاب ہو جائیں گے ۔ یہ میں انہی کی بات تم سے کہہ رہا ہوں "

وہ مسکرا رہا تھا ۔ اور اس کی مسکراہٹ میں جہل کا جنوں پنہاں تھا ۔

"یہی بات بتانا چاہتے تھے؟"

"ہاں ۔ ہم نے سوچا کہ بابوجی ہمارے مربّی ہیں ۔ ہم پیر صاحب سے ان کی بابت تو پوچھ لیں "

"شکریہ!" کوشل نے کہا ۔ اور وہ اٹھ کر چل دیا ۔ ابراہیم اپنی جگہ پر بیٹھا بدستور مسکراتا رہا ۔

(۱۴)

یہ جمعرات کا دن تھا۔ جمعرات کو فقیروں کی عید بھی کہا جا سکتا ہے۔ وہ چھ دن اس کے آنے کا انتظار کرتے گذار دیتے ہیں۔ اس روز جامع مسجد کے سامنے کتنے ہی خدا کے بندے ۔۔۔ خوشحال اور دولت مند لوگ خیرات بانٹتے ہیں۔ جو سینکڑوں فقیر جامع مسجد کی سیڑھیوں پر پڑے رہتے ہیں ان کے علاوہ اِدھر اُدھر سے' دِلّی کے تمام علاقوں سے فقیر آکر جمع ہو جاتے ہیں۔ خیرات لیتے ہیں اور دُعائیں دیتے ہیں۔ مفلس اور محتاج ہوتے ہوئے بھی ان کا رشتہ امیر طبقہ سے قائم رہتا ہے اور روز بروز مضبوط ہوتا چلا جاتا ہے۔ فقیر صرف دعائیں ہی نہیں دیتے بلکہ دل سے چاہتے ہیں کہ جو لوگ خوشحال اور سخی ہیں خدا انہیں دس گُنا دولت عطا کرے۔ جب خیرات باقاعدگی سے ملتی رہتی ہے۔ تو وہ سمجھنے لگتے ہیں کہ ان کی دعائیں بارگاہِ الٰہی میں باریاب اور مستجاب ہو رہی ہیں اور امیروں کو زیادہ دھن مل رہا ہے۔

یوں وہ خیرات پر اپنا حق سمجھتے ہیں۔

کوشل اس دن صبح کو دس بجے میدان میں آیا تھا۔ فقیر اس وقت ناشتہ کیا کرتے تھے۔ لیکن آج میدان خالی تھا۔ اکیلی مریم بیٹھی افق پر دیکھ رہی تھی۔

"سب لوگ کہاں گئے ہیں؟" کوشل نے دریافت کیا۔

"آج جمعرات ہے خیرات لینے گئے ہیں"۔ وہ بولی، اور پھر افق پر دیکھنے لگی۔

جمعرات کے دن اتنی خیرات بٹتی تھی کہ فقیر بریانی اور پلاؤ پیالوں میں بھر بھر کر جھونپڑوں میں رکھ چھوڑتے تھے۔ اور اُسے کئی دن تک کھاتے رہتے تھے۔ رفیق عموماً اِسی خوراک پر زندہ رہتا تھا۔ اگر ہفتہ میں ایک دو روز کھانے کو نہیں ملتا تھا۔ تو فاقہ کر لیتا تھا۔ جتنے دن خیرات ملی ہوئی یہ خوراک چلتی تھی۔ اس کی بیوی اس سے خوش رہتی تھی۔ لیکن اس کے ختم ہوتے ہی آپس کی لڑائی شروع ہو جاتی تھی۔ بیوی کو فاقے کرنا پسند نہیں تھا۔ وہ کھانے کو مانگتی تھی۔ اور جب رفیق کھلا نہیں سکتا تھا۔ تو وہ اس سے اُلجھ پڑتی تھی۔ خوراک کے علاوہ لڑنے کی ایک اور بھی وجہ تھی۔ اور وہ یہ تھی۔ کہ شاید اسے جامد اور بے حرکت زندگی سے نفرت تھی۔ وہ بھی کیا انسان ہے جو گھاس پھوس کی طرح پڑا رہے۔ جو کچھ مل جائے کھالے۔ ورنہ فاقے کرے۔ لیکن رفیق کے ساتھ لڑنے جھگڑنے کے علاوہ زندگی کو حرکت میں لانے اور اپنے اندر کا غصہ ظاہر کرنے کا اور کوئی طریقہ کار نہ تھا۔ اس لئے رفیق کو دو چار گالیاں دے کر اس کے دِل کا بوجھ ہلکا ہوتا تھا۔ اور غم زدہ روح کو کچھ تسکین حاصل ہو جاتی تھی۔

اس دن پریڈ گراؤنڈ میں خاص چہل پہل ہوتی تھی جنگل میں منگل

کا سماں نظر آتا تھا۔ کلیم اللہ کے مزار پر قوالی ہوتی تھی۔ قوالیاں سننے اور نیاز بانٹنے لوگ بھاری تعداد میں ادھر اُدھر سے آجاتے تھے۔ بہت سے خوش فکرے اس بہانے دل بہلانے چلے آتے تھے۔ بعض اپنے بکرے اور دُمبے بھی ساتھ لاتے تھے۔ جنہیں وہ قربانی کے لئے پال رہے ہوتے تھے۔ وہ ان کے ساتھ کھیلتے اور انہیں گھاس کھلاتے تھے۔ اسلامی شریعت اور روایات سے واقف لوگ بھی تشریف لاتے تھے۔ وہ پیری فقیری کے بلند مرتبہ تک پہنچے ہونے کا دعوےٰ کرتے تھے۔ اور اپنے گرد بھیڑ جمع کر کے بیٹھ جاتے تھے۔ مذہبی لوگ ان کی باتیں دھیان سے سنتے تھے۔ وہ اپنے ان عقیدت کیشوں کے لئے علمیت، روحانیت اور رومانیت کے دریا بہا دیتے تھے۔ باتیں بھی کرتے تھے اور سننے والوں پر مسکرا مسکرا کر نوازش کی نگاہیں بھی ڈالتے جاتے تھے۔ داد کی شکل میں ان سے خراجِ عقیدت وصول کر کے فخر محسوس کرتے تھے۔

اس طرح کے متعدد حلقے قائم ہو جاتے تھے۔ بعض مرتبہ کوئی دو فقیروں میں بحث بھی شروع ہو جاتی۔ جو رفتہ رفتہ اچھے خاصے دنگل کا روپ دھارن کر لیتی۔ دونوں طرف کے پہلوان خم ٹھونک کر آگے بڑھتے اور ایک دوسرے کو پچھاڑ دینے کی کوشش کرتے۔ ان مباحثوں میں دلیل اور معقولیت سے کہیں زیادہ اس بات کا خیال رکھا جاتا تھا کہ سامعین کو کس بات سے خوش کیا اور ہنسایا جا سکتا ہے۔ جو فقیر اپنی

بات سے جتنا زیادہ لوگوں کو ہنسانے میں کامیاب ہوتا تھا اتنا ہی اس کا مخالف اپنے آپ کو خفیف اور شرمندہ محسوس کرتا تھا حریف کی باتوں سے چڑ جانا۔ جھنجلا کر لڑنے پر آمادہ ہو جانا شکست کا واضح اعلان متصوّر ہوتا تھا۔

ویسے تو شام کو ہمیشہ ہی پتنگ باز۔ گپ شپ کرنے والے تماشبین اور سب طرح کے لوگ پریڈ گراؤنڈ میں جمع ہوتے تھے اور گھنٹہ دو گھنٹے تفریح کر کے چلے جاتے تھے۔ لیکن جمعرات کو تو یوں معلوم ہوتا تھا۔ کہ لشکر کے لشکر اتر آئے ہیں۔ اور انہیں روحانیت اور معرفت کے تمام مسائل آج ہی حل کرنے ہیں۔ لوگوں کے اس وسیع ہجوم میں بندے سائیں بھی خاص تمکنت کے ساتھ اِدھر سے اُدھر گھومتا نظر آتا تھا۔ سر پہ بڑا سا پگڑ۔ قمیص اور واسکٹ پہنے۔ کڑے پہنے اور تسبیح لٹکائے اور ہاتھ میں فقیری کا موٹا سا عصا اٹھائے مست بھینسے کی طرح "یا علی۔ یا علی" کا نعرہ لگاتا گھومتا پھرتا تھا کسی خوش باش اور سفید پوش کو دیکھ کر اس کے سامنے جا کھڑا ہوتا تھا۔ عجیب انداز سے سلام کرنے کے بعد دو چار باتیں کرتا اور آخر میں نہایت انکساری اور ملائمت کے سُر میں کہتا۔ "صاحب! ہمیں ایک بیڑی پلا دیجئے"۔ اس کا پُر وقار چہرہ اور روحانیت سے معمور آنکھیں دیکھ کر انکار کرنا مشکل ہو جاتا۔ "صاحب" حسب اوقات آنہ' دو آنے' چار آنے اس کے ہاتھ پر رکھ دیتا۔ اور وہ "یا علی۔ یا علی" کا نعرہ بلند کرتا ہوا آگے بڑھ جاتا۔

اس روز خوانچے والے بھی بھاری تعداد میں اِدھر آجاتے تھے۔ ان میں سے زیادہ تر مونگ پھلی۔ چنے۔ گاجر اور مولی بیچتے تھے اور کچھ کیلے اور سنگترے والے بھی ہوتے تھے۔ مہنگی چیزیں یہاں نہیں بکتی تھیں۔ لوگ مونگ پھلی اور چنے جیبوں میں بھر بھر کر اِدھر اُدھر گھومتے یا سامنے رکھ کر بیٹھ جاتے۔ آپس میں گپیں بھی ہوتیں اور چبینا بھی۔

میدان کیلے سنگترے اور مونگ پھلی کے چھلکوں۔ کاغذ اور شیشے کے ٹکڑوں۔ ٹوٹے ہوئے پروں اور چھوٹی چھوٹی ہڈیوں سے پٹا رہتا تھا۔ یہ سب چیزیں لوگوں کے پاؤں تلے آکر پستی رہتی تھیں۔ اور میدان کا جز بنتی رہتی تھیں۔ اور اسے تندرست و توانا بناتی تھیں۔ اِنسان صدیوں سے اس کے سینے کو روندتا آیا ہے۔ گھوڑوں اور فوجیوں نے اسے پائمال کیا ہے۔ اب بھی ہزاروں لوگ دندناتے اور روندتے پھرتے تھے۔ مگر وہ اطمینان سے لیٹا ہوا ہے۔ ان کے قدموں سے اسے ذرا بھی ضعف نہیں پہنچتا۔ بلکہ بیک وقت بہت سے لوگوں کو جمع دیکھ کر مسرّت سے کھل اٹھتا ہے۔ ان کی چاپوں میں زندگی کی دھڑکنیں محسوس کرتا ہے۔ اسے اپنا تمام وجود حرکت میں آتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ ایک کروٹ۔ وسیع کروٹ کی تمنا اس کے دل میں پرورش پا رہی ہے۔

میدان میں متعدد جگہ کیڑوں کی بانبیاں بنی ہوئی ہیں۔ مذہب پرست لوگ ان پر چاول۔ آٹا یا کوئی دوسرا اناج پھینک جاتے ہیں۔

کیڑے اس اناج کو اٹھا اٹھا کر گوداموں میں بھر لیتے ہیں۔ کوشل بارہا
ان کی جانفشانی اور محنت کو دیکھا کرتا تھا۔ وہ نہایت مستعدی سے اناج
کو اٹھا اٹھا کر بلوں کے اندر لے جاتے تھے۔ حتیٰ الوسع عجلت سے کام
لیتے تھے۔ وہ اناج کو چڑیوں اور گرسلوں کی خوراک بننے سے بچاتے تھے۔

مزار کی نکڑ پر پان بیڑی کی ایک دکان تھی۔ جس پر بجلی بھی لگی ہوئی
تھی۔ دکاندار سفید کپڑے پہنتا تھا۔ اور کچھ پڑھا لکھا بھی تھا۔ اس
کے پاس جو گاہک یا دوسرے لوگ آ بیٹھتے تھے۔ وہ انہیں اخبار کی
خبریں سنایا کرتا تھا۔ اور ساتھ ساتھ ان پر رائے زنی بھی کرتا تھا جس
سے اپنے علم اور واقفیت کا ثبوت پہنچانا مقصود ہوتا تھا۔ ایک دن
اس نے یہ خبر سنائی۔ کہ جمنا کے پانی کی باڑھ ہزاروں گاؤں کو بہا کر لے
گئی۔ اور اس پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا۔ "لوگ اپنے گناہوں کی سزا پا رہے
ہیں۔ خدا گناہوں کی سزا ضرور دیتا ہے۔" لوگ اس کی باتیں عقیدت
سے سنتے تھے۔ شاید وہ پشت در پشت سے یہیں کام کر رہا تھا۔ جہاں اسے
یہ دکان وراثت میں ملی تھی۔ وہاں یہ علم اور روحانیت بھی وراثت
میں ملی تھی۔ وہ دکاندار ضرور تھا۔ لیکن اس کا روحانی مرتبہ کسی پیر فقیر
سے کم نہیں تھا۔ ورنہ وہ خیرات کے پیسوں سے منافع کیسے اخذ کر
سکتا تھا؟

جمعرات کو دکان کے قریب دو تین پھول والے آ بیٹھتے تھے۔
لوگ یہ پھول مزار پر چڑھانے کے لئے خریدتے تھے۔ مزار کے دروازہ

پر فقیر دو رویہ بیٹھ جاتے تھے۔ صرف اس میدان میں رہنے والے ہی نہیں۔ آس پاس کی بستیوں اور پارکوں سے دوسرے فقیر بھی آ جاتے تھے۔ قوالی شروع ہونے سے گھنٹوں پہلے آمنے سامنے جم کر بیٹھ جاتے تھے۔ ہر ایک فقیر یہ کوشش کرتا تھا کہ وہ دروازے کے قریب تر بیٹھ سکے۔ کیونکہ خیرات دروازے سے بٹنا شروع ہوتی تھی۔ اور بعض مرتبہ اخیر تک پہنچتے پہنچتے سخی کی سخاوت کا دریا سوکھ جاتا تھا۔ اور قطار کے آخر میں بیٹھنے والے فقیر خیرات سے محروم رہ جاتے تھے۔

فقیر چپ چاپ بیٹھے قوالیاں سنتے ہاتھ پھیلائے رہتے اور خیرات ملنے پر آنکھوں سے دعائیں نکلتیں۔

اس دن بھی جمعرات تھی۔ قوالی ہو رہی تھی۔ فقیر دو قطاروں میں آمنے سامنے مزار کے دروازے پر بیٹھے تھے۔ ان میں میدان کے باسی بھی شامل تھے۔ وہ بجھی بجھی آنکھوں سے اِدھر اُدھر دیکھ رہے تھے۔ لوگ جمع ہونے شروع ہو گئے تھے۔ مزار کے اندر کا صحن بھر گیا تھا۔ جنگلے کے باہر بھی کافی بھیڑ جمع ہو گئی تھی۔ عورتوں کو اندر داخل ہونے کی ممانعت تھی۔ وہ دور ہی سے مزار کو دیکھ رہی تھیں اور قوالی سن کر روح کو تسکین دے رہی تھیں۔ قوالی کے بول تھے :-

جہاں رقص کرتی ہے روحِ محبّت
میں سرحدِ منزل پہ اب آگیا ہوں
سلامت رہے جستجوئے محبّت

جسے ڈھونڈتا تھا اُسے پاگیا ہُوں

قوال جھُوم رہے تھے۔ اور تال پر تال دئے جا رہے تھے۔ لوگ سن سن کر محظوظ ہو رہے تھے۔ موسیقی سے محروم روحوں کو اس بہانے نغمگی کا لُطف حاصل ہو رہا تھا۔

(۱۵)

کوشل ایک روز صبح۔ بہت ہی صبح اُٹھ کر میدان میں آیا۔ دسمبر کے آخری دن تھے۔ سردی کا زور بڑھ گیا تھا۔ رات بھر ہوا بہت تیز چلتی رہی تھی۔ کمرے سے باہر نکلتے ڈر لگتا تھا۔ وہ رات بھر رضائی اور کمبل میں دُبکا رہا تھا۔ دوہرا اوڑھنا ہونے پر بھی جاڑا محسوس ہوتا تھا۔ وہ پڑا پڑا سوچتا تھا۔ کہ ایسے میں میدان کے باسیوں پر کیا گذرتی ہوگی؟ کیا گذرتی ہوگی۔ یہ دیکھنے کے لئے اس نے فیصلہ کیا کہ دن نکلنے سے پہلے پہلے وہ میدان میں جائے گا۔ اور اپنی آنکھوں دیکھے گا۔ کہ یہ لوگ سردی کی بھیانک راتیں کیسے کاٹتے ہیں؟

جب وہ میدان میں پہنچا بہت سویرا تھا۔ سُورج نکلنے میں ابھی دیر تھی۔ لیکن کیلے کے بائیں طرف پیڑوں کے جھرمٹ میں شفق پھُولی ہوئی تھی۔ اور اس میں سے روشنی کا انبار پھوٹا پڑتا تھا۔ فضا ساکن اور خاموش تھی۔ ہوا تیز نہیں تھی۔ اس میں خنکی کے باوجود روح پرور تازگی تھی۔ ایک سحر پرور کیفیت طاری تھی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے

کسی نے رات کو میدان پر جادو پھونک دیا ہو۔

کوشل کے ہاتھ میں انگریزی کا اخبار تھا۔ وہ صبح اٹھ کر اخبار پڑھتا تھا۔ اب ساتھ اٹھا لایا تھا۔ کہ میدان میں بیٹھ کر طلوع آفتاب کا منظر دیکھے گا۔ اور اخبار پڑھے گا۔ گھاس شبنم سے بھیگی ہوئی تھی۔ تمام فضا نمدار معلوم ہو رہی تھی۔

وہ درخت کے نیچے جا کر کھڑا ہو گیا۔ اس وقت کوئی بھی فقیر لیٹا ہوا نہیں تھا۔ ساری بستی جاگ اٹھی تھی۔ اور سب لوگ اپنی اپنی جگہ پر مختصر اوڑھنوں میں لپٹے ہوئے بیٹھے تھے۔ قلندر کی دھونی میں آگ سلگ رہی تھی۔ دو چار آدمی اس کے گرد بیٹھے آگ تاپ رہے تھے۔ جھنیا اور اس کے خاوند نے بھی آگ سلگا رکھی تھی۔ اور وہ اپنے بستر پر بیٹھے بیٹھے اور اوڑھنوں میں لپٹے لپٹے رات کا جاڑا دور بھگا رہے تھے۔ مریم البتہ آگ جلانے کی تیاری میں مصروف تھی۔ جمال اور عبدالصمد کے بائیں طرف دو فقیرنیاں جو ادھیڑ عمر کی تھیں اور جن کے سر کے بال پک رہے تھے کسی بات پر آپس میں جھگڑ رہی تھیں۔ وہ دو تین دن ہوئے۔ اِدھر آئی تھیں۔ ان کے ساتھ ایک مرد بھی تھا۔ جو اس وقت وہاں موجود نہیں تھا۔

اُن کے چہروں پر رات کی غیر معمولی سردی کا کوئی اثر معلوم نہیں ہوتا تھا۔ جس حالت میں کوشل انہیں ہر روز دیکھتا تھا۔ اسی حالت میں وہ اب بھی بیٹھے تھے۔ جیسے درخت کی ٹہنیوں پر پرندے سوتے ہیں۔

اور صبح اٹھ کر چھپاتے ہیں۔ ویسے ہی نیچے یہ لوگ سوئے تھے اور اب مطمئن اور بشاش نظر آتے تھے۔ کہتے ہیں کہ رات کے وقت گھنے درختوں تلے نہیں جانا چاہیئے۔ کیونکہ ان کے نیچے بھوت چڑیل رہتے ہیں اور انسانوں سے چپٹ جاتے ہیں۔ جن سے ان کے سر چکرانے لگتے ہیں۔ لیکن یہ لوگ رات بھر یہیں رہتے تھے۔ انہیں کوئی بھوت پر یت نہیں چپٹے۔ ان کے سر ذرا نہیں چکراتے۔ شاید جس طرح درخت رات کو آکسیجن کھاتے اور کاربن چھوڑتے ہیں۔ اسی طرح یہ لوگ اس کے بالکل برعکس رات کو آکسیجن چھوڑتے اور کاربن کھاتے ہیں۔ جب ایک خاص قسم کے ماحول میں آدمی کی فطرت بدل جاتی ہے۔ تو یہ بھی ممکن ہے۔ کہ فطری عمل بھی بدل جاتا ہو۔ جب انہوں نے اپنی زندگی کو درخت کی زندگی سے ہم آہنگ بنالیا ہے۔ تو درخت کے بھوت انہیں کیسے ستا سکتے ہیں؟

"بابو صاحب! کیا لکھا ہے اخبار میں؟ ہمیں بھی تو سنائیے"؟ جمال نے کہا۔

کوشل اس کے قریب جا بیٹھا۔ وہ اپنی پیوندلگی رضائی میں لپٹا بیٹھا تھا۔ اور اس کے دونوں لیلے دونوں طرف دائیں اور بائیں پہلو میں دُبکے ہوئے تھے۔ جس طرح وہ جمال کے جسم سے گرمی حاصل کرتے تھے۔ اسی طرح اسے گرمی پہنچاتے بھی تھے۔ یہ دو طرفہ عمل تھا۔ جمال بیٹھا بیڑی پی رہا تھا۔ اس نے کوشل کو بیڑی پیش کرنا مناسب

نہیں سمجھا - اس لئے اپنی گدڑی میں سے قینچی کی سگریٹ کی ڈبیا اور دیا سلائی نکال کر اس کے آگے رکھ دی - کوشل نے شکریہ کے ساتھ اسے واپس کر دیا - کیونکہ وہ سگریٹ نہیں پیتا تھا -

جمال کی نگاہیں اخبار پر جمی ہوئی تھیں - کوشل پہلے دل ہی دل میں خود پڑھتا تھا - اور پھر اسے ایسی خبر کا خلاصہ کر کے سنا دیتا تھا - جسے وہ بآسانی سمجھ سکتا ہو - اور جو ایسی نہ ہو - اُسے چھوڑ دیتا تھا - مثال کے طور پر ہند چینی اور برما کے عوام اپنے حقوق اور اپنی قومی آزادی کے لئے لڑ رہے تھے اور آج اخبار میں یہ خبر شائع ہوئی تھی - کہ ہند چینی کے بہادر دیش بھگتوں نے فرانسیسی سامراجیوں کو مار بھگایا ہے - اور ان سے دو اہم چوکیاں چھین لی ہیں - کوشل نے جمال کو یہ خبر سنانا چاہی - لیکن اس کی عدم توجگی کے باعث درمیان ہی میں چھوڑ دی - اخبار میں ایک خودکشی کی خبر چھپی تھی - اور وہ اپنی ہی راجدھانی سے تعلق رکھتی تھی - جمال نے اس خبر میں خاص دلچسپی کا اظہار کیا - سبزی منڈی میں ایک جوان عورت نے اپنی دو سالہ بچی کے ساتھ اپنے آپ کو زندہ جلا لیا تھا - جس کی وجہ یہ تھی - کہ اُس کے خاوند نے دو تین ہفتے پہلے ریلوے پُل سے کود کر خودکشی کر لی تھی - کیونکہ وہ بے کار تھا - اور اُسے گذارہ کی کوئی سبیل نظر نہیں آتی تھی - اور اب اس کی بیوی نے بھی خودکشی کر لی تھی - کیونکہ جب خاوند ہی مرد ہو کر کچھ نہ کر سکا - تو وہ

بے چاری عورت جس پر باعزت روزی کمانے کی سب راہیں بند ہیں کیا کر سکتی تھی۔ جمال یہ خبر پڑھ کر قدرے چونک اٹھا تھا۔ شاید وہ سوچ رہا تھا کہ آدمی کو کام نہ ملے۔ بھیک تو مل جاتی ہے پھر انہیں مرنے کی کیا ضرورت تھی۔

"آپ اونچی آواز سے پڑھتے رہیئے نا"۔ عبدالصمد نے کوشل سے کہا۔

"نہیں۔ انگریزی اپنے ہی دماغ میں پڑھی جاتی ہے"۔ جمال نے اپنے ہاتھ کی انگلیوں سے چمچ سا بنا کر ذہن کی طرف اشارہ کیا۔

"لو۔ ایسی کیا بات ہے! کیا کبھی کسی کو انگریزی پڑھتے نہیں سنا؟"

"ہاں۔ انگریزی بھی اونچی پڑھی جاتی ہے"۔ کوشل بولا۔ اور اس نے چند سطریں بہ بلند آواز پڑھ کر سنائیں۔

اس اثنا میں ان دو عورتوں کے ساتھ جو آدمی تھا۔ وہ وہاں آکر بیٹھ گیا۔ وہ ٹھنگنے قد کا آدمی تھا۔ اور اس کی دائیں کن پٹی کے قریب روپے جتنا ایک سیاہ داغ تھا۔ جیسے کبھی پھوڑا ہوا ہو۔ یا لہسن نکلا ہو۔ صحت اچھی تھی۔ اور چہرہ لشاش تھا۔ سرکس کا یہ پہلا روز تھا۔ اور وہ اس طرف سے لوٹ کر آرہا تھا۔ آتے ہی بولا:۔

"میں اور رفیق جہاں ٹکٹ بٹتے ہیں پیسے ڈھونڈنے گئے تھے۔

رات کو جیب میں سے اکثر کچھ نہ کچھ گر ہی جاتا ہے۔ رفیق کو ایک دوّنی اور شبیر کی تصویر والی ایک چونی ملی۔ لیکن اپنی اپنی قسمت ہے۔ میں نے بھی بہتیرا ڈھونڈا۔ مجھے صرف یہ پنسل ملی۔"

اس کے ہاتھ میں سُرخ رنگ کی پنسل کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا تھا۔ جو وہ اب جمال اور عبدالصمد کو دکھا رہا تھا۔

"ٹھیک ہے۔" ایک عورت نے جو شاید اس کی بیوی تھی اس کی پیٹھ ٹھونکتے ہوئے کہا۔ "تم لکھنے پڑھنے والے آدمی جو ہوئے۔ تمہیں پنسل ہی تو ملنی تھی۔"

اور سب لوگ مسکرائے۔ لیکن جمال ٹس سے مس نہ ہوا۔ خاموش بیٹھا رہا۔ کسی بات کا اس پر کیا اثر ہوا۔ چہرے سے اس کا اندازہ بہت کم ہوتا تھا۔

"سرکس تو اچھا معلوم ہوتا ہے؟" کوشل بولا۔

"نہیں۔ کوئی کمال نہیں۔ ایسے تماشے تو مداری بھی دکھا جاتے ہیں۔" جمال نے کہا۔ "یہاں سے سب نظر آتا ہے۔ ہم دیکھ رہے تھے۔"

سرکس والوں نے کناتیں لگا رکھی تھیں۔ مگر یہاں درخت کے نیچے بیٹھ کر ان کے اوپر سے سٹیج پر جھانکا جا سکتا تھا۔ باہر اندھیرا اور اندر اجالا ہونے کے باعث سب نظر آتا تھا۔ شامیانہ کناتوں سے کافی اونچا تھا۔

"لونڈیا نے تاروں پر جو ناچ دکھایا۔ وہ تو کمال کی بات ہے۔"

پنسل والے آدمی نے ناچ اور رونڈیا کا تصوّر آنکھوں میں بھر کر کہا۔

"ہاں وہ اچھا تھا"۔ جمال نے آہستہ سے کہا۔ اور پھر بولا:۔ "ٹکٹ زیادہ ہے۔ سوا روپیہ ڈھائی روپیہ اور ساڑھے تین روپے۔ غریب آدمی تو پھر بھی دیکھ لیتے ہیں۔ لیکن امیر نہیں آتے"۔

"سرکس میرٹھ سے آیا ہے۔ ہم بھی وہیں تھے"۔ پنسل والے آدمی نے کہا۔ "میرٹھ میں ٹکٹ اتنا نہیں تھا۔ وہاں نو نو آنے سے شروع ہوتا تھا"۔

"یہ شہر بھی بڑا ہے"۔ جمال نے کہا۔

ایک کتّا زمین سُونگھتا سُونگھتا اِدھر آنکلا۔ اس کا رنگ سفید۔ جسم چُست اور مضبوط تھا۔ شکل و صُورت بھی اچھی تھی۔ دُم ہلاتا ہُوا بہت ہی بھلا معلُوم ہوتا تھا۔ "موتی۔ موتی!" جمال نے اسے پچکارا۔ اور بیٹھ جانے کا اشارہ کیا۔ کُتّا بیٹھ گیا۔

جمال نے اس کی طرف ہمدردی سے دیکھا اور بیڑی کا ایک کش لگا کر بولا۔ "بڑا اچھا کُتّا ہے۔ اب ذرا آوارہ ہو گیا ہے۔ پہلا سا وہ ٹھاٹھ بھی نہیں رہا۔ اس کا مالک پاکستان چلا گیا ہے۔ دیکھو سامنے جو ہوٹل ہے پہلے یہ اس کا مکان تھا۔ وہ ڈاکٹر تھا۔ بہت ہی مشہور۔ موٹر تھی۔ نوکر تھے۔ موتی بھی وہیں رہتا تھا۔ موٹر میں گھومتا تھا۔ اور دونوں وقت صابون سے مَل مَل کر نہلایا جاتا تھا۔ مرغن غذائیں کھاتا تھا۔ اور گدیلوں پر سوتا تھا۔ اس کا جسم روئی کی طرح

چٹا سفید تھا۔ اب تو بہت میلا ہو گیا ہے۔ اب تو یہیں ہمارے ساتھ خاک پر لیٹا رہتا ہے۔ جب سے یہاں رہنے لگا ہے۔ بےچارے کی حالت بگڑ گئی ہے"!

جمال نے یہ قصّہ سنایا۔ اور چُپ ہو گیا۔ اس کے چہرے پر ایک گونہ تسکین اور اطمینان کی جھلک دکھائی دی۔ آنکھوں کا رنگ بدل گیا۔ جیسے کوئی گہری بات سوچ رہا ہو۔ شاید وہ کُتّے کے خوشحال ماضی کا تصوّر کر رہا تھا۔ شاید اُسے اپنے ماضی کی کوئی کہانی یاد آ رہی تھی۔

کوشل نے اس کُتّے کو پہلے بھی کئی بار دیکھا تھا۔ اور کُتّوں کے ساتھ وہ بھی گھوما کرتا تھا۔ نورے کے کالے کتے سے وہ واقعی اچھا تھا۔ لیکن کوئی خاص بات نہیں تھی۔ کوشل کو اس سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ لیکن اب جمال کی زبان سے یہ کہانی سن کر وہ اس کی طرف دھیان سے دیکھنے لگا۔ اور اس کے ذہن میں جمال کی وہ کہانی ابھر آئی۔ جو رشید نے اسے سنائی تھی۔ پہلے وہ قرول باغ میں رہتا تھا۔ درزی کا کام کرتا تھا ...... اور؟ —— اور اب یہاں پڑا ہے۔ مگر اس کہانی کے کچھ اور بھی تو پہلو ہونگے۔ جواب تک سربستہ راز بنے ہوئے ہیں۔ یہ راز کیسے عیاں ہو؟ پھر جمال ہی کی کیوں؟ ان میں سے سبھی کی ایک نہ ایک کہانی ہے۔ یہ سب لوگ جو میدان میں پڑے ہیں یا پڑے رہنے پر مجبور ہیں۔ ہر ایک

کی ایک نہ ایک کہانی ہے۔ جب یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ ایک کتا اس میدان کا باسی کیسے بنا؟ تو یہ کیوں معلوم نہ ہو۔ کہ یہ لوگ —— اتنے انسان اس میدان کے باسی کیونکر بنے؟ کیا دنگوں کے سے بھیانک اور انسانیت سوز واقعات اس سماج میں ہمیشہ نہیں ہوتے رہتے؟ کیا انسان کے پاس ان کا کوئی بھی سدِ باب نہیں ہے؟ کوئی علاج نہیں ہے؟

سیلاب آتا ہے تو گاؤں اور کھیتوں کو بہا کر لے جاتا ہے۔ انسان اور انسان کی محنت کو برباد کرتا ہے۔ لیکن دریا پر بند باندھ دینے سے سیلاب رُک جاتا ہے۔ اس پانی سے بجلی پیدا کی جا سکتی ہے۔ کھیتیاں سینچی جا سکتی ہیں۔ اسی طرح سماج میں جو سیلاب آتا ہے۔ کیا اُسے نہیں روکا جا سکتا؟ تاکہ انسان، انسان اور بہتر شہری بن سکے۔ فقیر بن کر بھٹکنے کے بجائے اپنی محنت اور تخلیقی قوت سے خوبصورت زندگی کی تعمیر کر سکے۔

کوشل اسی بات پر غور کر رہا تھا۔ اس کا حل سوچ رہا تھا۔ اور انسان کے مستقبل کا تصور کرتا ہوا اپنے آپ میں کھو گیا تھا۔ کچھ دیر اس پر یہی کیفیت طاری رہی۔ لیکن جمال اور عبدالصمد کا خیال تھا کہ وہ اخبار پڑھ رہا ہے۔

جمال کے لیلے اس کی بغل سے نکل آئے تھے۔ ان کے جسموں پر گدڑیاں بندھی ہوئی تھیں۔ جو انہیں جاڑے سے بچائے رکھنے کے لئے

جمال نے اپنے ہاتھ سے سی ہفنیں - اب انہیں اُتار کر الگ رکھ دیا - جسم پر ہاتھ پھیرا - تھوتھنیوں کو بار بار سہلایا - اور ان کی پیشانیوں کو ہونٹوں سے چُوم کر اس طرح پیار کیا جس طرح ماں اپنے بچے کو نیند سے جاگنے کے بعد دُلارتی ہے اور رات بھر سینے میں رُکی ہُوئی موہ ممتا کو اس پر انڈیلتی ہے -

" خُوب سوئے بیٹا! خُوب سوئے!! سردی تو نہیں لگی؟ اچھا اب کھیلو - تھوڑی دیر میں تمہیں ناشتہ دینگے"- جمال شہزادے سے باتیں کر رہا تھا -

" اس کی طبیعت کچھ سُست ہے - دو چار روز سے زکام ہے - ہینگ بھی دی ہے لیکن آرام نہیں ہوا - سُسری کہیں مر نہ جائے"- اب کے وہ شہزادی کو سہلا رہا تھا -

کوشل نے یہ اِلفاظ سُنے - اور وہ جمال کی جانوروں سے یہ محبّت دیکھ کر حیران رہ گیا -

(۱۶)

امیر علی کو جب دیکھو - انگوچھا باندھے اور کوٹ پہنے دکھائی دیتا ہے - اور کوٹ کے کالر پر جو پھُول لگا رہتا ہے وہ بھی گویا اس کے لباس کا ایک جزُو بن چکا ہے - اب بھی وہ اپنی پوری پوشاک زیب تن کئے بستر پر بیٹھا تھا - ایک گٹھڑی سی سامنے کھلی پڑی تھی - جس میں سگرٹ

کی ڈبیوں سے نکلے ہوئے چمک دار ورق - کچھ چیتھڑے - ٹوٹے ہوئے ڈبے اور دیگر کباڑ بھرا ہوا تھا - گٹھڑی کھول کر وہ ان چیزوں کو دو چار منٹ تک حسرت اور پیار سے دیکھتا رہا -- دیکھتا رہا - اور پھر مسکرانے لگا - پھر اس نے اس کباڑ میں سے ٹوٹے ہوئے آئینوں کے کئی ٹکڑے نکالے - اور ان میں سے جو ٹکڑا سب سے بڑا اور صاف تھا - اس میں اپنا چہرہ دیکھا - انگوچھے اور کوٹ کے کالروں کو سنوارا - اور پھر مسکرایا - اس مرتبہ یہ مسکراہٹ ہونٹوں سے کانوں تک پھیل گئی تھی -

نورا امیر علی کے سامنے بیٹھا تھا اور اس کے اس سرمایہ حیات کو غور سے دیکھ رہا تھا - شاید وہ دل ہی دل میں سوچ رہا تھا کہ موقع ملے - تو آنکھ بچا کر اس میں سے دو چار چیزیں اور نہیں تو کم سے کم ایک دو چمکدار ورق ہی اپنے کرتے کے نیچے چھپالے - لیکن اسے اپنے دل کے یہ ارمان نکالنے کا موقع نہیں ملا - امیر علی نے کالر اور ڈھول سنوار کر آئینے کا ٹکڑا واپس کباڑ میں رکھ دیا - اور گٹھڑی سمیٹ لی - نورا بے چارا دیکھتا ہی رہ گیا - اور وہ پاس بیٹھے ہوئے کتے کی گردن سہلانے لگا -

کوشل حتیٰ ان لوگوں میں گھومتا تھا - انہیں قریب سے دیکھتا تھا - اتنا ہی وہ ان کے چور دروازوں سے واقف ہوتا جا رہا تھا - ان کی ہر ایک حرکت اور ہر ایک فقرے میں زندگی کی عجیب اور طویل داستانیں پنہاں تھیں -

دسمبر کے اخیر اور جنوری کے شروع میں سرد ہوائیں خوب چلتی ہیں۔ اور جسم کو چیرتی ہوئی نکل جاتی ہیں۔ چھوٹے سے چھوٹے دن اور بڑی سے بڑی راتوں کا یہی ایک مختصر سا عرصہ ہوتا ہے۔ جب سردی بے رحم سامراج کی طرح اپنی قوتوں سے دنیا بھر کو مرعوب کرنا چاہتی ہے۔ اور اس کے حملوں کی زد میں یہ لوگ سب سے زیادہ آتے ہیں۔ کوشل ایک ایسی ہی سرد رات کو نو دس بجے پریڈ کے میدان میں گھوم رہا تھا۔ رات اندھیری تھی۔ تارے نکلے ہوئے تھے۔ اور دھواں ماحول میں بدستور رچا ہوا تھا۔ پرندے گھونسلوں اور انسان اپنے اوڑھنوں میں دبکے پڑے تھے۔ وہ گھومتے گھومتے مزار کے پچھواڑے چلا گیا۔ ابراہیم کی چارپائی سے اسے کراہنے کی آواز سنائی دی۔ کوشل اس کے پاس چلا گیا۔ ابراہیم سخت تکلیف میں مبتلا تھا۔ اور درد کے مارے کروٹیں بدل رہا تھا۔ کوشل کو دیکھ کر بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ "ان لوگوں نے مار مار کر میری نو پسلیاں توڑ دیں۔ میں دو دن سے کھاٹ سے لگا پڑا ہوں۔ آپ تو ادھر آئے ہی نہیں۔"

"بات کیا تھی؟ کوئی ویسے ہی تو نہیں مارنا۔ آخر کوئی وجہ تو ہو گی؟" کوشل نے دلجوئی کرنے کے بعد پوچھا۔

"یہاں کچھ فقیرنیاں آئی تھیں۔ جو ان لوگوں کے پاس ٹھہری تھیں۔ یہ کہتے ہیں کہ میں نے انہیں چھیڑا ہے۔"

"جب وہ کہتے ہیں تو اس میں ذرا ماشہ کچھ نہ کچھ سچائی تو ہوگی؟"

"بابوجی! سچائی کیا ہوگی؟ مجھے اگر عورت کی ضرورت ہوتی۔ تو فقیر ہی کیوں بنتا؟ اگر میں چاہوں تو ایک نہیں دو دو رکھ سکتا ہوں۔ ان کی طرح کوئی نکما۔ نٹھلا تھوڑی ہی ہوں۔ کما کر کھاتا ہوں آپ دیکھتے ہو۔ کبھی کسی کو بھوکا نہیں سونے دیا۔"

"یہ تو ٹھیک ہے۔ لیکن سمجھ میں نہیں آتا۔ کہ ان لوگوں نے تمہیں خواہ مخواہ کیوں پیٹا؟"

"کسی وقت کل دن میں آکر آپ ان لوگوں سے بات تو کیجئے۔ بڑے سور مانتے ہیں۔ میں برداشت کر گیا کہ چلو جانے دو۔ ورنہ تھانے میں رپٹ کر دیتا۔ تو وہ سب کو باندھ کر لے جاتے۔"

"لیکن یہ لوگ پیر کی پناہ میں رہتے ہیں۔ تم رپٹ کر دگے تو پیر صاحب ناراض ہونگے۔"

"اسی لئے تو میں نے رپٹ نہیں کی۔ آپ ان لوگوں کو سمجھائیں کہ آپس میں لڑا نہیں کرتے۔ یہ ظلم کرتے ہو۔ تبھی تو تمہاری یہ حالت ہوئی ہے۔ اور پھر مفت میں مجھے بدنام بھی کر رہے ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ میں تو ایسا آدمی نہیں ہوں۔"

"ہاں! مجھے تو یقین ہے کہ تم بھلے آدمی ہو۔"

کوشل نے اس کی دلداری کے لئے کہا۔ مگر اسے ابراہیم کے وہ الفاظ یاد آرہے تھے۔ جو اس نے پنجابی فقیرنی کی طرف للچائی

ہوتی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہے تھے۔ "ہمیں تو ایسے آدمی کو اپنے ساتھ کھلانے کی تمنا رہتی ہے"۔ یہ محض مذاق نہیں تھا۔ اس کے دل میں عورت کی ہوس تھی۔ اور آنکھیں اس کی غماز تھیں۔ کیا تعجب کہ ان فقیرنیوں میں بھی ایسی حسینہ موجود ہو۔ جسے دیکھ کر یہ تمنا پھر بیدار ہو اٹھی ہو۔ اور ابراہیم نے اسے سچ مچ چھیڑا ہو۔

کوشل اس کے قریب چارپائی پر بیٹھ گیا۔ پانچ چھ منٹ تک اس سے باتیں کرتا رہا۔ اور اسے یقین دلاتا رہا۔ کہ وہ کل ان لوگوں سے ضرور بات کرے گا اور انہیں سمجھائے گا۔

دو جھونپڑوں کے درمیان آگ سلگ رہی تھی۔ اور دونوں جھونپڑیوں کے مکین رفیق۔ رفیق کی بیوی اور ان کی پڑوسن بیٹھے آگ تاپ رہے تھے۔ شاید ان کے پاس کپڑا کافی نہ ہو اور سونے سے تاپنا بھلا لگتا ہو۔ کوشل کو پڑوسن کا نام معلوم نہیں تھا۔ لیکن وہ اس سے بخوبی واقف تھا۔ وہ ایک بچے کی ماں تھی۔ چہرہ ملائم۔ گمبھیر اور گول تھا۔ گالوں پر گوشت بھی کافی تھا۔ تندرست معلوم ہوتی تھی۔ وہ بات بھی آہستہ آہستہ اور متین سُر میں کرتی تھی۔ آپس کے لڑائی جھگڑے اور رنڈاچخلی سے اُسے سروکار نہیں تھا۔ وہ گویا کنول کی طرح تالاب میں بھی رہتی تھی۔ اور پانی سے بھیگتی بھی نہیں تھی۔ کوشل جانے ان جانے اس کے قریب آکھڑا ہوتا تھا۔ اور اس کی باتیں سُننا پسند کرتا تھا۔ اس کا خاوند بھی بیوی کی طرح متین اور گمبھیر تھا۔

عمر میں وُہ رفیق کے برابر ہو گا۔ لیکن تندرست اور توانا تھا۔ دن میں وہ وہاں کہیں نظر نہیں آتا تھا۔ شاید محنت مزدوری کر کے اپنا اور بیوی بچوں کا پیٹ پالتا تھا۔ اس لئے کام پر چلا جاتا تھا۔

"وہ آدمی بڑا اچھا ہے۔ اس نے ہمیں اتنی روٹیاں دے دیں۔ کہ ہم دو دن تک کھاتے رہے"! رفیق نے جو بات شروع کر رکھی تھی۔ اُسے جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"مکئی کی روٹیوں میں مزا بھی تو بڑا آتا ہے"! اس کی بیوی بولی۔

"مکئی کی روٹی ہمارے گاؤں میں بنتی تھی۔ اور ہم ساگ کے ساتھ کھاتے تھے"۔ پٹروسن نے گذرے ہوئے دنوں کا تصوّر کرتے ہوئے کہا۔

"ساگ تو تمہارے ہاں اس دن بھی آ گیا تھا اور بڑا چوکھا آیا تھا۔ تم نے مجھے جو دیا تھا۔ وُہ اس نے تو چکھا ہی نہیں۔ میں نے دو روٹیاں کھائیں اور پیٹ بھر گیا۔ ساگ اچھا بنا تھا"۔

رفیق کی بیوی نے جب بات ختم کی۔ تو یُوں معلوم ہوا۔ کہ وہ ہونٹوں پر زبان پھیر کر ساگ کا مزا لے رہی ہے۔

"بیٹھ جاؤ۔ تم بھی آگ تاپ لو"۔ پٹروسن نے کوشل کو کھڑا دیکھ کر کہا۔

"بس ٹھیک ہے۔ تم بیٹھی رہو"۔ کوشل نے کھڑے کھڑے ہی کہا۔ "دو تین دن سے ہوا بڑی تیز چل رہی ہے"۔

"ہاں رات کو سردی کے مارے نیند نہیں آتی اور دن بھر دھوپ میں پڑے رہنے سے بھی کچھ نہیں بنتا۔ جیسے دھوپ میں گرمی نہ ہو۔"

کوشل چپ چاپ ان الفاظ پر غور کرنے لگا۔ یہ لوگ دن چھپتے ہی سو جاتے تھے۔ اور اب تک بیٹھے آگ تاپنے کا مطلب یہی تھا۔ کہ رات کو سردی کے مارے نیند نہیں آتی۔ کوشل کی نظروں میں وہ بے شمار لوگ گھوم گئے۔ جو دن بھر ٹانگیں پھیلائے میدان میں گھاس پھوس کی طرح لیٹے رہتے تھے۔

"یہ حرام کے تخم۔ کنجر کے بیٹے ...... میں ان سالوں کی بہن..

......"

بائیں طرف سے بندے سائیں کی ہڑبونگ سنائی دی۔ وہ تیز تیز بول رہا تھا۔ اور اس کے الفاظ سلگتے کی گولیوں کی طرح کانوں میں اترتے جا رہے تھے۔ سننے سے تکلیف ہوتی تھی۔

"تو سن لو۔ گالیاں تو اسے یوں رواں ہیں۔ جیسے اردو بول رہا ہو۔" منتین عورت نے کہا۔

"گالیاں تو یہ اتنی بکتا ہے کہ کان پک جاتے ہیں۔" رفیق کی بیوی نے نفرت کا اظہار کیا۔

"اور پھر کوئی دین ایمان نہیں۔" منتین عورت کوشل سے مخاطب تھی۔ "کوئی ہندو آئے گا۔ تو اسے —— جے ہند کہے گا اور مسلمان

سمجھتے گا۔ تو سلام سلام کر کے اس پر چڑھ دوڑے گا۔ پھر پیٹھ پیچھے دونوں کو گالیاں دیگا۔ دونوں کو حرام زادے بتائے گا۔ سڑک پر سے کوئی جنازہ نکلے تو یہ دوڑ کر جائے گا۔ دس قدم تک اسے کندھا دیگا۔ پھر لوٹ کر کہے گا۔ اچھا ہوا سالہ مر گیا۔ موٹر کو دیکھ پہلے سلام کرتا ہے جب وہ دُور نکل جاتی ہے۔ تو پتھر کی طرح گالی پھینک دیتا ہے"۔

جب یہ باتیں ہو رہی تھیں۔ بندے سائیں ڈول ہاتھ میں لئے ادھر آ نکلا۔ اور لمحہ بھر کے لئے آگ کے قریب ٹھہر گیا۔

"ابھی تمہاری ہی باتیں ہو رہی تھیں۔ کہہ رہے تھے۔ کہ گالیاں تمہیں اُردو کی طرح رواں ہیں"۔ کوشل بولا۔

"اُردو والے کی ایسی کی تیسی۔ اور انگریزی والے کی ماں ..."

اس نے پھر گالی دی اور کہا "ہم باون زبانیں جانتے ہیں اور سب میں لٹم شٹم۔ گٹم پھٹا پھٹ بولتے ہیں"۔ اور وہ پانی لینے چلا گیا۔

"دیکھا! اب بھی باز نہیں آیا۔ گالیاں تو اس کی خوراک بن گئی ہیں"۔ مُنیّن عورت نے تبصرہ کیا۔ اس وقت جھونپڑے میں پڑا ہوا اس کا بچہ چلّایا۔ شاید اُسے سردی لگ رہی تھی۔ وہ محبّت بھری نرم آواز میں بولی۔

"آئی بیٹا!"

× × × × × × ×

"ادھر آیا۔ تو ٹانگیں توڑ دینگے۔ کیا مطلب ہے اس وقت گھومتے

پھرنے کا ہے"

کوشل جب یہاں سے جامن کے درخت کی طرف چلا۔ تو جھنیا عورتوں کے پاس بیٹھی ان سے یہ الفاظ کہہ رہی تھی۔ نہ معلوم وہ کس پر ناراض ہو رہی تھی۔ کوشل بھی ادھر سے ہو کر گذر رہا تھا۔ شاید وہ اس کے متعلق یہ بات کہہ رہی ہو۔ لیکن جب وہ قریب آیا۔ تو وہ خاموش ہو گئی۔

جمال اُکڑوں بیٹھ بیڑی پی رہا تھا۔ اس نے صرف ایک قمیض پہن رکھی تھی۔ اوڑھنے کا کمبل پرے پڑا ہوا تھا۔ جیسے اس نے سردی کا چیلنج منظور کر لیا ہو۔ جیسے یہ خنک اور تیز ہوا اس کے جسم کو راحت پہنچا رہی ہو۔ البتہ اس نے شہزادے کو اس کی گدڑی اوڑھا رکھی تھی۔ اور اس کے نیچے بھی ایک گدی بچھا دی تھی۔ تاکہ زمین کی سردی اس کے جسم میں سرائت نہ کرے اور وہ آرام سے سو سکے۔

"شہزادی کہاں گئی؟" کوشل نے دریافت کیا۔

"اس کو ایک آدمی کے ہاتھ پانچ روپے میں بیچ دیا ہے۔ یہاں رہتی تو مر جاتی۔ وہاں شاید بچ جائے"۔

"رشید بھی نظر نہیں آتا"۔

"یہیں گھوم رہا ہو گا" اس نے مختصراً جواب دیا اور اپنی پہلی بات جاری رکھی۔ "پانچ روپے بہت تھوڑے ہیں۔ میں نے اُسے بیچنے کے لئے نہیں پالا تھا۔ علاج بھی بہت کیا۔ اس کا نزکام دور نہیں ہو

سکا۔ اگر بچ گئی۔ تو میں اسے پھر لے آؤنگا۔ آدمی اپنی جان پہچان کا ہے۔ نہ بچی۔ تو گرمیوں میں اور خرید لونگا۔"

"گرمیوں میں تو کوئی تکلیف نہیں ہوتی؟"

"نہیں گرمیوں میں تو خوب کھیلتے ہیں۔"

جمال کی بیڑی ختم ہو گئی تھی۔ وہ اپنے ہاتھ کا ٹکڑا پرے پھینک کر سونے کی تیاری کرنے لگا۔ اسی اثنا میں مزار کی طرف سے رشید بھی آ گیا۔ اس کا بستر بچھا ہوا تھا۔ اس پر پیوند لگی رضائی رکھی ہوئی تھی۔ وہ آتے ہی بستر پر لیٹ گیا۔ جمال نے سیگرٹ کی ڈبیا اور دیا سلائی اپنے سامان میں سے نکال کر اس کے سرہانے رکھتے ہوئے کہا۔

"دیکھو۔ سیگرٹ اور دیا سلائی یہاں رکھے دیتا ہوں۔"

"اچھا۔" رشید نے ہنا دیکھے ٹانگوں پر رضائی لپیٹتے ہوئے جواب دیا۔

"ہوں گندا کہیں کا۔ اتنا بڑا ہو گیا۔ ابھی تک یہ سمجھ نہیں آئی کہ کپڑے پر پیشاب نہیں کیا کرتے!"

شہزادے نے اپنے نیچے بچھی ہوئی گدی پر پیشاب کر دیا تھا۔ جمال نے اسے الگ ہٹا کر گدی کو اٹھا کر جھٹکا۔ اور الٹا کر کے بچھا دیا۔ اور شہزادے کو پھر اس پر بٹھاتے ہوئے کہا۔

"بھیگ گئی۔ اب ساری رات سردی میں مرے گا!"

"برسات آئے گی۔ تو کہاں جاؤ گے؟" کوشل نے دریافت کیا۔

"یہ دکانیں اور مکان سب ہمارے ہیں۔ ہم بادشاہ بھی ہیں۔ اور فقیر بھی۔ ہمیں کوئی منع نہیں کرتا!" جمال نے بڑی شان سے کہا۔ اور بولا "میں اگر کوتوالی میں رہنا چاہوں۔ تو بھی کوئی منع نہیں کر سکتا۔ ہم نے صاحب بہادر کی نوکری کی ہے!"

"اچھا۔ کب کی تھی نوکری۔ اور وہ چھوڑ کیوں دی؟"

"میں پہلی بڑی جنگ میں بھرتی ہو کر لڑنے گیا تھا۔ امریکہ۔ برما۔ افریقہ۔ فرانس اور روس سب دیکھے ہیں۔ اور ہندوستان کا تو چپہ چپہ چھان مارا ہے۔ کلکتہ۔ بمبئی۔ ناگ پور۔ پٹنہ۔ الہ آباد میرٹھ۔ لکھنؤ۔ کراچی اور لاہور کونسا شہر ہے جو میں نے نہیں دیکھا!"

"اچھا۔ تو سارے ہندوستان میں گھوم چکے ہو؟"

"اور کیا۔ ساری عمر گھومتے ہی تو گذری ہے۔ یہاں تو دو سال سے رہنے لگا ہوں!"

"یہ رشید بھی تمہارے ساتھ گھومتا تھا؟"

"نہیں وہ اپنی ماں کے پاس رہتا تھا۔ میں اکیلا ہی گھومتا تھا!"

"اس کی ماں اب کہاں ہے؟"

"مر گئی!"

"کتنا عرصہ ہوا؟"

"یہی پانچ سات سال ہوئے ہونگے!"

وہ یوں کہہ رہا تھا۔ جیسے بیوی کا مر جانا اس کی بابا اس کے بیٹے کی زندگی میں کوئی المناک حادثہ نہ ہو۔ جیسے یہ ایک فطری امر ہو۔ اور اسے اس بات سے کوئی سروکار نہ ہو۔ ایسے واقعات ہر روز ہوتے رہتے ہیں۔ کون ان کی تاریخیں اور سال یاد رکھتا پھرے۔ باپ کی طرح رشید کے دل پر بھی اس بات کا کوئی ملال نہیں تھا۔ وہ اس کی باتیں یوں خوش ہو کر سُن رہا تھا جیسے وہ کوئی دلچسپ کہانی ۔ کوئی لطیفہ بیان کر رہا ہو۔

"اس وقت سے رشید تمہارے پاس رہتا ہے؟"

"ہاں ۔ اب سکول میں پڑھنے جاتا ہے۔ اس وقت آٹھویں جماعت میں تعلیم پا رہا ہے ۔ اس سے پہلے میں علی گڑھ میں صاحب کے پاس نوکر تھا ۔ ایک سو ستّر روپے ماہوار تنخواہ ملتی تھی ۔ رشید بھی وہیں چھٹی جماعت میں پڑھا کرتا تھا۔ جب وہ دس جماعت پاس کرے گا۔ تو ہم پھر صاحب کے پاس جائیگا ۔ اور کہے گا کہ ہمارے بیٹے کو سفارش کر کے افسر بنوا دو ۔ رشید افسر بن جائے گا۔ پانچسو روپے ماہوار تنخواہ ملیگی اور ٹھاٹھ سے رہے گا . . . . ."

جمال کہہ رہا تھا ۔ رشید کو اس کی یہ باتیں سن کر ہنسی آ رہی تھی۔ وہ ہنسی کو ضبط کرنے کی لاکھ کوشش کرتا تھا ۔ لاکھ کروٹیں بدلتا اور رضائی کو جسم پر لپیٹتا تھا۔ مگر ہنسی رکتی نہیں تھی ۔ جس طرح میدان کو سینچنے والے نل کا پیچ کھل جانے سے پانی بزور اٹھتا ہے اور

بلندیوں پر پہنچ کر اِدھر اُدھر بکھر جاتا ہے ۔ اسی طرح ہنسی رشید کے اندر سے پھوٹ پھوٹ کر نکل رہی تھی ۔ اور اُچھلتی پھیلتی اِدھر اُدھر بکھر رہی تھی ۔ جمال بھی مسکرا رہا تھا ۔ اپنے الفاظ سے آپ ہی محظوظ ہو رہا تھا ۔

کوشل کو اس ہنسی اور ان مسکراہٹوں کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی ۔ وہ رشید کو ہر وقت میدان میں کنکوے اڑاتے اور کھیلتے کودتے دیکھا کرتا تھا ۔ اس کے سکول جانے اور پڑھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا ۔ اس لئے اس کے پڑھنے کی یہ ساری داستان بالکل من گھڑت تھی ۔ اس ایک واقعہ نے جمال کا اصلی رُوپ ظاہر کر دیا تھا ۔ جمال نے آج تک جتنی باتیں کی تھیں وہ سب اسی طرح خیالی اور من گھڑت تھیں ۔ جب تک وہ انہیں سچی سمجھتا رہا تھا ۔ وہ بے معنی ۔ فضول اور مجذوب کی بڑ معلوم ہوتی تھیں ۔ لیکن آج وہ باتیں سنگ مرمر کی مورتیوں کی طرح مجسم ۔ ٹھوس خوبصورت اور معنی خیز بن گئی تھیں ۔ وہ جمال کی آرزوئیں تھیں ۔ وہ اپنے بیٹے کو پڑھانا اور افسر بنانا چاہتا تھا ۔ ...... اس کی چھپکلی افریقہ سے آئی تھی ۔ اور محض ہوا کھا کر زندہ رہتی تھی ۔ اے کاش ! وہ بھی ہوا کھا کر زندہ رہ سکتا ۔

کوشل وہاں سے چلا ۔ تو بہت خوش تھا ۔ جیسے اس نے کوئی معمّہ حل کر لیا ہو ۔ ایک ان بوجھی پہیلی بوجھ لی ہو ۔ خنک ہوا اسے اچھی لگ رہی تھی ۔

کوشل کام میں اس قدر مصروف رہا۔ کہ دو تین روز ادھر نہیں آسکا۔ اب چلا تو اسے ابراہیم کا خیال آیا۔ اس کی کراہیں اور درد بھرا لہجہ یاد آیا "اُن سے پُوچھنا تو سہی۔ مجھے کیوں مفت میں بدنام کرتے ہیں"؟ سوچا۔ چلو پہلے اسی کی خیر خبر پوچھ لوں۔ دوستی کا تقاضا ہے۔ کہ اس وقت اس کے ساتھ کچھ ہمدردی کی جائے۔ لیکن جا کر دیکھا تو ابراہیم کی چارپائی اور اس پر بنی ہوئی اس کی مختصر سی جھونپڑی کا وہاں نام و نشان تک نہیں۔ سوچا۔ ممکن ہے پیر صاحب نے پھر اسے الف شاہ کے مزار پہ بھیج دیا ہو۔ اور شاید ان لوگوں نے اسے پھر مارا ہو۔ اور مار مار کر یہاں سے بھگا دیا ہو۔ وجہ خواہ کچھ بھی ہو۔ کوشل کو اس کا وہاں سے چلے جانا معمولی اور فطری امر معلوم ہوا جو شخص جن لوگوں میں رہتا ہے۔ اگر وہ انہی کو حقیر اور ذلیل سمجھ کر ان سے نفرت کرتا ہے۔ اور اپنے تئیں فنے خاں تصور کرتا ہے۔ تو اسے اسی طرح بے عزت ہو کر وہاں سے جانا پڑتا ہے۔

کوشل کو ابراہیم کے چلے جانے کا ذرا بھی افسوس نہیں تھا۔ بلکہ وہ اس بات پر حیران ہو رہا تھا۔ کہ اس نے پہلے روز ابراہیم کو کیسے شریف آدمی سمجھ لیا؟ وہ اس کی لفاظی سے کیوں ٹھگا گیا؟ آدمی کے بیرونی اور اندرونی روپ میں کتنا تضاد رہتا ہے۔ اس کو فوراً سمجھ

لینا کس قدر مشکل ہے۔

وہاں کوئی نہیں تھا۔ صرف اس جھونپڑی کے آگے۔ جہاں ابراہیم رہتا تھا۔ بچے کھیل رہے تھے۔ جامن کے درخت کے نیچے بھی کوئی شخص نظر نہیں آیا۔ سب اِدھر اُدھر گئے ہوئے تھے۔ کوشل اس طرف کو چل دیا۔ جس طرف مارکیٹ بننا شروع ہوئی تھی۔ لیکن بن نہیں سکی تھی۔ اور اب تو کھوکھے بھی اٹھ گئے تھے۔

تین چار بجے کا وقت تھا۔ دھوپ سہانی معلوم ہو رہی تھی۔ میدان میں چھوٹی چھوٹی گھاس اُگی ہوئی تھی۔ لیکن اکثر جگہ جہاں گھاس نہیں تھی۔ سفید اور مٹ میلے ٹکڑے یوں پھیلے ہوئے تھے جیسے میدان کو جذام ہوا ہو۔ دس پندرہ گز کے فاصلے پر سڑک کی طرف ڈھلوان کچھ زیادہ تھا۔ اور اس جگہ گھاس بھی لمبی اور گھنی تھی۔ یہاں کچھ لوگ بیٹھے گپیں ہانک رہے تھے۔ قریب ہی ایک خوانچے والا بیٹھا تھا جو مہنگائی کا رونا رو رہا تھا۔ اسے شکایت تھی۔ کہ سارا دن محنت مزدوری کرنے پر بھی پیٹ نہیں بھرتا۔

" ادھر بھی۔ اُدھر بھی۔ غریب آدمی دونوں طرف بھوکے مرتے ہیں۔ انہیں کوئی نہیں پوچھتا۔" ان میں سے ایک آدمی بولا۔

یہ آدمی پاکستان گیا تھا۔ سال ڈیڑھ سال اِدھر اُدھر ٹھوکریں کھانے کے بعد ہندوستان لوٹ آیا تھا۔ اور اپنے تجربے کی بات کہہ رہا تھا۔ اسلامی راج سے جو امیدیں وابستہ کر رکھی تھیں۔ وہ پوری

نہیں ہوئی تھیں ۔اس نے اپنی آنکھوں دیکھ لیا تھا۔کہ بڑے آدمی چھوٹے آدمیوں کو لوٹتے ہیں ۔ انہیں مذہب کے نام پر بے وقوف بناتے ہیں ۔اور اپنا اُلو سیدھا کرتے ہیں ۔

" بھوک تو پہلے سے بھی زیادہ بڑھ گئی ۔دیس کے بٹوارے سے کیا ملا ۔اور یہ آزادی کیا ہوئی ؟"

" دیکھو! مَیں جو کہتا ہوں اسے مانو!" ان میں سے ایک پتلا دُبلا آدمی جس کا سر گھٹا ہوا تھا ۔اور جس نے سُرخ رنگ کا سوئیٹر پہن رکھا تھا ۔تیز تیز آواز میں بولنے لگا ۔" میں تجربے کی بات کہتا ہوں ۔یہاں پھر فساد ہوگا ۔پھر دنگا مچے گا ۔تم نے جو دنگا دیکھا ہے ۔یہ اس سے بہت بھیانک ہوگا ۔"

سب لوگ اس سُرخ سوئیٹر والے کی طرف یوں دیکھنے لگے جیسے کہہ رہے ہوں کیسی بہکی بہکی باتیں کرتا ہے ۔ایک دنگا ہوا اس نے لاکھوں کو تباہ اور برباد کر دیا ۔یہ اور دنگے کی بات کرتا ہے ۔پاگل ہوا ہے ۔

" لیکن یہ دنگا ایسا نہیں ہوگا ۔جیسا پہلے ہوا تھا ۔اس میں ہندو ہوں یا مسلمان ۔جتنے چھوٹے ہیں سب ایک طرف ہونگے اور بڑے ایک طرف پہلے دیس کا بٹوارہ ہوا تھا اب دھن کا بٹوارہ ہوگا ۔بھوک مٹے گی ۔تب کہیں امن ہوگا ۔تب کہیں یہاں انسان بستے دکھائی دینگے ۔اب تو انسان ہی نہیں ہیں ۔"

"لو اور سُنو - کہتا ہے - یہاں انسان ہی نہیں ہیں"۔ کسی نے اعتراض کیا۔

"دیکھو میں پھر کہتا ہوں - میری بات بالکل ٹھیک ہوتی ہے اور سولہ آنے سچ ہوتی ہے - میں نے آج تک جتنی باتیں کہی ہیں - ان میں سے ایک بھی جھوٹی ثابت کر دو - تو میں تمہیں سیگرٹ بھر کر پلاؤنگا ورنہ تم مجھے سیگرٹ بھر کر پلانا" - سُرخ سویٹر والے نے اپنا ننگا اور گھٹا ہوا سر ہلاتے ہوئے خود اعتمادی اور وثوق کے ساتھ کہا - اور ایک منٹ خاموش رہنے کے بعد پھر کہنا شروع کیا -

"میں اس آزادی کو آزادی نہیں مانتا - یہ سب ڈھونگ ہے - اور یہ لوگ انسان بھی نہیں ہیں - بھوک اور لاعلمی نے انہیں بھرم میں ڈال رکھا ہے - آج سو میں پچانوے بلکہ اٹھانوے آدمی ہندو اور مسلمانوں میں بٹے ہوئے ہیں - جب سچ مچ آزادی آئے گی بھوک اور لاعلمی دور ہوگی - تب احساس جاگے گا - اور انسان بنیگا - اور میں دعوے سے کہتا ہوں" - اُس نے خم ٹھونک کر کہا - "تب دیس پھر ایک ہو جائے گا"!

سب چُپ بیٹھے تھے - اس کے یہ الفاظ فضا میں گونج رہے تھے - وسعتوں میں پھیل رہے تھے - کون کہہ سکتا ہے کہ ان میں صداقت کتنی تھی - لیکن وہ اتنی خود اعتمادی اور یقین کے ساتھ کہے گئے تھے - کہ انہیں جھٹلانا مشکل تھا - جو شخص اب تک اس کی

مخالفت کر رہا تھا۔ وہ بھی گھاس کا ایک تنکا دانتوں میں دبائے ہوئے خلاء میں جھانک رہا تھا اور چپ بیٹھا ان الفاظ کو فضا میں گونجتے ہوئے سُن رہا تھا۔

"میرے دماغ میں" سرخ سویٹر والا آدمی انگلی سے ماتھے کو ٹھونکتا ہوا پھر بولا "شوجی کی تیسری آنکھ ہے۔ میں اس آنکھ سے سب کچھ دیکھتا ہوں۔ سب کچھ جانتا ہوں۔ اور سب کو دیکھتے اور جانتے ہوئے ہی میں نے یہ بات کہی ہے۔ تم سوچو تو سہی۔ دنیا کدھر جا رہی ہے؟"

"اچھا۔ تم کیا یاد کرو گے۔ آؤ تمہیں اسی بات پر سگریٹ پلائیں"۔

اس آدمی نے جو کچھ عرصہ پاکستان میں رہ کر لوٹ آیا تھا سگریٹ نکال کر سُرخ سویٹر والے کو پیش کی۔

"بھری رکھی ہے نا؟"

"ہاں۔ خوب بھری ہوئی ہے۔ اطمینان سے پیو"!

اس نے سگریٹ سلگائی۔ اور دم کھینچ کر دھوآں اُوپر کو چھوڑ دیا اور اسے حلقے بناتے ہوئے اوپر چڑھتے دیکھنے لگا۔

کوشل اٹھ کر چل دیا۔ یہ لوگ سلفئے یا رہیں۔ سارا سارا دن دم لگاتے ہیں اور بیکار گپیں ہانکتے ہیں۔ وہ یہ سوچتے ہوئے میدان میں ٹہلنے لگا۔ میدان کے طول وعرض میں بہت سے لوگ بکھرے پڑے تھے۔ اب دھوپ نہیں تھی پھر بھی انہیں اس دھرتی پر لیٹے رہنا اچھا لگتا تھا۔ یہاں انہیں سکھ ملتا تھا۔ آرام ملتا تھا۔ اور جسم میں تازگی اور قوت

آتی تھی ۔ چمپی والے ۔ مالش والے ۔ بیکار اور فقیر ۔ جیسے نصف دِلّی میدان میں آ بسی ہو ۔ ہر روز نیئے چہرے دکھائی دیتے تھے اور جب بھی کوئی نیا چہرہ سامنے آتا تھا ۔ کوشل کو عبد الصمد کے یہ الفاظ یاد آ جاتے تھے "یہ پریڈ گراؤنڈ بے گھروں اور غریبوں کی پناہ گاہ ہے "۔ اور زمین پر ہاتھ ٹیکتا ہوا عبد الصمد اس کی نگاہوں میں مجسّم ہو کر ابھر آتا تھا ۔

سائے پھیلتے پھیلتے ایک دُوسرے سے گلے مل گئے تھے ۔ سردی کا دن ڈوبتے کیا دیر لگتی ہے ۔ جُوں جُوں دن ڈوب رہا تھا ۔ سردی بڑھ رہی تھی ۔ ہوا کافی خنک ہو گئی تھی ۔ کچھ کچھ اندھیرا بھی ہو چلا تھا ۔ کوشل کے دماغ میں بیک وقت کئی خیال گھوم رہے تھے ۔ اور آپس میں گڈمڈ ہو رہے تھے ۔ اس لئے کوئی بھی بات واضح شکل اختیار نہیں کر پاتی تھی ۔ جب آدمی کا ذہن صاف نہ ہو ۔ تو باہر کی چیزیں بھی صاف نہیں رہتیں ۔ بڑھتے ہوئے اندھیرے وہاں بیٹھے ہوئے لوگ یُوں معلوم ہوتے تھے جیسے ملبے کے ڈھیر پڑے ہوں ۔ جیسے راجدھانی کی شاندار عمارتیں کھیپ در کھیپ ٹوٹ کر اس میدان میں گرتی جا رہی ہوں اور وہ خود کو اس ملبے کے تلے دبتا ہوا محسوس کر رہا ہو ۔ "دبنے" کے خیالی ڈر نے اسے یک بیک چونکا دیا ۔ اس نے گردن اوپر اٹھائی ۔ اور وہ نیم بیداری کی سی کیفیت میں بڑبڑایا "ہاں یہ سماج ٹوٹ رہا ہے ؟ ٹوٹ رہا ہے ۔ اسے ٹوٹنے سے کوئی شخص اور کوئی فرد بچا نہیں سکتا "۔ کوشل اب مکمل طور پر بیدار تھا ۔ اس کے خیالات میں بھی تسلسل

پیدا ہو گیا تھا۔ اس نے اپنے یہ الفاظ واضح طور پر سنے تھے۔ اور وہ ان پر غور کر رہا تھا۔ اور انہیں دل ہی دل میں دوہرا رہا تھا "ہاں یہ سماج ٹوٹ رہا ہے۔ ٹوٹ رہا ہے!" اس نے اچانک یہ الفاظ کیوں کہے تھے؟ ان کا مطلب کیا تھا؟ اہمیت کیا تھی؟ کیا یہ بھی فضول اور بے معنی تھے؟

ہر ایک شخص کی کم از کم اپنی نظر میں تو کچھ اہمیت ہوتی ہے۔ اس لئے اس کی اپنی بات کی بھی ایک اہمیت ہوتی ہے۔ پھر ہم دوسرے کی بات کو فضول اور مہمل کیوں کہہ دیتے ہیں؟ یہ عبدالصمد، جمال۔ مریم۔ مریم کے گھر والا اور ننگے اور گھٹے سر والا اسلفیؒ جو کچھ کہتے ہیں۔ وہ بے کار اور فضول کیوں ہے؟ جب ان میں سے ہر ایک کی کم از کم اپنی نظر میں ایک اہمیت ہے۔ تو ان کی بات کی بھی اہمیت کیوں نہیں ہے؟

یہ ایک پیچیدہ سوال اُٹھ کھڑا ہوا تھا۔ جس پر کوشل غور کر رہا تھا۔ اور بڑھتے ہوئے اندھیرے میں گھور گھور کر اس کا جواب ڈھونڈ رہا تھا۔

یہ سماج ٹوٹ رہا ہے۔ جو لوگ اس میدان میں اور دلّی کے دوسرے پارکوں میں بھرے پڑے ہیں۔ وہ اس سماج کے ٹوٹے ہوئے اعضاء ہیں۔ جو شخص جد و جہد کرتے کرتے ہار جاتا ہے۔ شکست تسلیم کر لیتا ہے یا محنت کا معاوضہ نہ ملتے دیکھ کر محنت کرنا چھوڑ دیتا ہے۔ وہ بے کار اور نکمّا سمجھا جاتا ہے۔ اور پھر اس شخص کی بات بھی بے کار اور نکمّی سمجھی جانے لگتی ہے ....

"محنت سے بات کی اہمیّت بنتی ہے"۔ کوشل ایک دم اچھل پڑا۔ وہ اپنی رُوح میں مسرّت کو جلوہ گر اور رقصاں محسوس کر رہا تھا۔ جیسے اس نے سوچتے سوچتے ناقابلِ تردید صداقت کو پالیا ہو۔ اس نے ایک مسلمہ اصُول کی کھوج لگائی ہو۔

وہ اس صداقت اور اصُول کو دل میں لئے چپ چاپ گھُومنے لگا۔ وہ اب کچھ بھی سوچنا نہیں چاہتا تھا۔ اور ذہن کو اس خیال کے علاوہ باقی سب خیالات سے مبرّا کر لینا چاہتا تھا جیسے اس ازلی صداقت کو پاکر اسے اور کچھ پانے کی تمنا نہ رہ گئی ہو۔ وہ اپنی حرکتِ فکر کو بریک لگا کر وہیں روک لینا اور ٹھہرا لینا چاہتا تھا۔

لیکن خیال کو۔ حرکتِ فکر کو باندھ رکھنا تو ممکن نہیں۔ انسان ہر حال میں سوچتا ہے۔ اگر وہ آگے کی بات سوچنا بند کر دے۔ تو پیچھے کی بات سوچنے لگتا ہے۔ پیچھے کی بات سوچتے سوچتے اس سے پھر آگے کی بات پیدا ہو جاتی ہے۔ اگر وہ اس پر توجہ نہ دے۔ تو وہ دُنیا کی دوڑ میں پچھڑ کر ماضی پرست بن جاتا ہے۔ اور اس کا ذہن اور روحانی ارتقاء رُک جاتا ہے۔ کوشل کے دل میں جب آگے کی بات سوچنے کی خواہش نہ رہی۔ تو تصوّر پیچھے کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کے ذہن میں عبدالصمد، جمال۔ مریم اور سلفیؔ بار بار ابھرنے لگے۔ وہ اب ان کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اور بات میں سے بات نکل رہی تھی۔ ان لوگوں نے زندگی میں ہار مان لی ہے۔ محنت کا عوض نہ ملتے دیکھ کر محنت سے جی

چرانے لگے ہیں۔۔۔۔۔۔۔اسی لئے۔۔۔۔۔۔نکمے۔۔۔۔۔! لیکن اس بات کا ایک دوسرا پہلو بھی تھا۔ کہ وہ محنت سے جی نہیں چُراتے۔ کام چاہتے ہیں۔ پر کام انہیں ملتا نہیں۔ سماج ان کی محنت اور ان کی قوت تعمیر و تخلیق کو استعمال میں نہیں لاتا۔ یعنی انہیں جان بوجھ کر اور زبردستی نکمّا اور بے کار بنا دیا گیا ہے۔ بے کار سوچنے اور اس میدان میں پڑے رہنے پر مجبور کر دیا گیا ہے۔

کوشل جس قدر سوچتا تھا اتنا ہی یہ پہلو ایک ٹھوس حقیقت بن کر سامنے آ رہا تھا۔ وہ اس سماج کو ٹوٹتے دیکھ رہا تھا۔ اور ملبے کے انبار کے انبار اس کی نظروں کے سامنے ابھر رہے تھے اور وہ سوچ رہا تھا کہ موجودہ سماج میں ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں سدا کے شرنارتھی رہتے ہیں۔ اور وہ زندگی کا بوجھ کندھوں پر اٹھائے گھوم رہے ہیں۔

اس میں ان کی خطا کیا ہے؟ جب سماج نے انہیں نکمّا اور بے کار بنایا ہے وہی ان کی بات کو نکمی اور بیکار کہہ کر ٹالنا اور نظر انداز کرنا چاہتا ہے اور وہ لوگ جنہوں نے چند سکوں کے عوض اپنے ضمیر کو اس سماج کے اجارہ داروں کے ہاتھ بیچ رکھا ہے۔ جو تھوڑی سی آمدنی میں اپنا اور اپنے بیوی بچوں کا پیٹ پالنے کے عادی ہو چکے ہیں یا بہت ہوا۔ تو صوفوں پر بیٹھ کر شیخی بگھارنے کی سہولت حاصل کر لیتے ہیں۔ یوں ان کی زندگی تساہل سے گذر رہی ہے۔ اس سے ان کی فکر بھی تساہل پسند اور مفلوج ہو جاتی ہے۔ اور وہ اس سماج کے دعووں اور قاعدہ قانونی

پر بآسانی یقین لے آتے ہیں کیونکہ وہ خود اس سماج کا ایک جزو بنے ہوئے ہیں۔ وہ بھی ان لوگوں کو بیکار اور نکمّا سمجھتے ہیں۔ وہ ان کی بات کو کوئی اہمیت نہیں دیتے۔ کیونکہ انہیں نکمّا اور حقیر سمجھ لینے سے انہیں اپنا مقام کچھ اونچا دکھائی دینے لگتا ہے۔ انکا سطحی علم اور سطحی واقفیّت فخر سے پھولی نہیں سماتی۔

کوشل ہموار جگہ پر گھوم رہا تھا۔ وہ کھویا کھویا سا گھومتا اور سوچتا رہا۔ لیکن اچانک اسے ٹھوکر سی لگی۔ وہ ٹھہر گیا۔ اور اسے محسوس ہوا کہ وہ پھر آگے کی بات سوچ رہا ہے۔ جو آدمی حساس ہے۔ سمجھ دار ہے اور عوام میں گھل مل کر رہتا ہے۔ اور ان کے دکھ سکھ کو اپنا سکھ دکھ سمجھتا ہے وہ اپنے آپ میں ڈوب کر کیسے رہ سکتا ہے۔ صرف ماضی ہی کی بات کیسے سوچ سکتا ہے؟

اس نے فکر پر سے پابندی اٹھا دی اور اسے بے روک ٹوک آگے کی طرف بڑھنے دیا۔ اس کے ذہن میں عبدالصمد، جمال ۔۔۔ اور سب سے زیادہ سرخ سویٹر والا سلفی ابھر آیا تھا۔ کوشل نے اس کی اور اس کی بات کی ابھی جو تضحیک کی تھی وہ اسے اپنی بھول دکھائی دیتی تھی۔ وہ در اصل اسے نظر انداز کر نہیں سکا تھا اور نظر انداز کر دینا ممکن بھی نہیں تھا۔ اس کی باتوں سے متاثر ہو کر ہی تو وہ دنگے اور فسادوں کے بارے میں سوچنے لگا تھا۔ قتل و غارت اور آتش زدگی کے کتنے ہی خوفناک منظر اس کی آنکھوں میں ابھر آئے ہیں۔ ماضی کے دو تین سالوں کی کہانی مجسّم ہو کر نظروں کے سامنے آ کھڑی ہوتی تھی۔ لوگوں نے یہ سب کچھ اپنی مرضی سے تو نہیں کیا تھا اور کوئی بھی شخص یک بیک اس قدر وحشی اور پاگل نہیں ہو سکتا۔ اس وحشت اور بربریت

کے بیج پہلے۔ بہت پہلے سے اس سماج میں پرورش پا رہے تھے۔ یہ قتل و غارت صدیوں سے رُکے ہوئے ارتقاء کی کہانی ہے جس سماج کا ارتقاء رک جائے وہ بوسیدہ اور کھوکھلا ہو کر ٹوٹتا رہتا ہے اور تاریخی صداقت ان جانے ہی اس کے ان الفاظ میں سمٹ آئی تھی "ہاں یہ سماج ٹوٹ رہا ہے ٹوٹ رہا ہے!"۔

کوشل ایکبار پھر چونک اُٹھا جیسے اس نے ایکبار پھر کوئی بوجھ پہیلی بوجھ لی ہو۔ جب اس کی بات کے پیچھے ایک تاریخی کہانی ہے جو اچانک اسکے الفاظ میں سمٹ آئی ہے تو ان لوگوں کی باتوں میں بھی جنہیں نکمّا اور بیکار سمجھ کر نظرانداز کیا جاتا ہے۔ تاریخی کہانیاں چھپی رہتی ہیں انہیں بھی تو زندہ رہنے کے لئے جد و جہد کرنی پڑتی ہے۔ وہ دوسروں کی حقارت اور بے اعتنائی کا شکار ہوتے ہیں۔ حساس دل پر ہر لمحہ زخم کھاتے ہیں۔ ان کی جد و جہد۔ ان کا تجربہ کتنا ٹھوس اور جاندار ہے۔ تجربے اور جد و جہد سے صداقت جنم لیتی ہے۔

کوشل جھنجلایا۔ اسے اپنے آپ پر، اپنے غلط رویے پر رنج ہو رہا تھا۔ کیونکہ اس نے سلفیؔ کو نکمّا اور بیکار سمجھ کر اس کی بات کو نظرانداز کیا تھا۔ سلفیؔ ہے تو کیا؟ آدمی ہے اور ہر ایک آدمی خواہ وہ کسی بھی حالت میں ہو عظیم ہے۔ فطرت جب اپنی مادی صورت میں بھی جامد نہیں ہے۔ سوچتی اور حرکت کرتی ہے تو آدمی تو اس مادّے کی، اس کے شعور کی بہترین شکل ہے اور اس کی سوچ بھی بہترین ہے۔ پھر اس کی بات کی تضحیک کیسی؟ اس سے بے نیازی کیوں؟ اور جو بات جد و جہد اور تجربے سے پیدا ہوتی ہے وہ بلاشبہ لافانی اور امٹ ہے۔ آدمی مر جاتا ہے۔ اس کی بات زندہ رہتی ہے!

کوشل کا دل حقارت اور نفرت کے جذبہ سے پاک تھا۔ آدمی کا عظیم اور مقدس روپ اس کے سامنے تھا سرخ سویٹر والا سلفی بھی آدمی کے اس رُوپ کا نمائندہ معلوم ہو رہا تھا اور وہ انگلی سے ماتھا ٹھونک کر بصد فخر کہہ رہا تھا۔ "میرے دماغ میں شوجی کی تیسری آنکھ ہے"

"شوجی کی آنکھ"! کوشل نے آپ ہی آپ دوہرایا۔ شوجی کی اس آنکھ کی بھی ایک تاریخ تھی جو داستانِ حیات کی طرح طویل اور ارتقاء پذیر تھی۔ کوشل جتنا سوچتا تھا اتنا ہی اسے یہ آنکھ پھیلتی اور بڑھتی ہوئی محسوس ہوتی تھی جیسے اس آنکھ کو آدمی کے تخیل نے جنم دیا ہو۔ لیکن تخیل بھی تو تبھی زندہ رہتا ہے۔ جب اس کی بنیاد تجربے اور حقیقت پر ہوتی ہے۔ شوجی کی یہ آنکھ محض تخیل محض مفروضہ نہیں ہے کیونکہ عوام کو ترے تخیل سے محض مفروضہ سے اتنا موہ اتنا پیار نہیں ہوتا۔ یہ تیسری آنکھ آدمی کے جگ جگ کے گیان کا سمبل ہے جو ہمالہ کی بلندترین چوٹی سے ساری دُنیا۔ کل کائنات کو دیکھ رہی ہے اور نئے شعور کی ترجمانی کر رہی ہے۔

یہ آنکھ عوام کا مجموعی شعور ہے جو تجربے اور جد و جہد سے بڑھتا رہتا ہے۔ اور اس آنکھ میں چمک اور جلال پیدا کرتا ہے۔ یہ آنکھ کم و بیش ہر شخص کے دماغ میں رہتی ہے۔ جو شخص جتنا دوسروں میں گھل مل کر رہتا ہے، سوچتا ہے اور محسوس کرتا ہے۔ اس کی یہ آنکھ اتنی ہی روشن اور واضح ہو جاتی ہے۔ ہر دور کی ایک سچائی ہوتی ہے۔ جو عوام کے مجموعی عمل سے جانی جاتی ہے۔ ایسے شخص کے منہ سے یہ سچائی اپنے آپ ان جانے میں بول اٹھتی ہے۔ اگر وہ شخص اتفاق سے باعمل ہو تو اس سچائی کے

؎ شوجی کی تیسری آنکھ پرانے کو فنا اور نئے کی پرورش کرتی ہے یعنی نئے شعور کا سمبل ہے۔

مطابق عمل کرتا ہے اور اپنے اس عمل سے ہزاروں لاکھوں دوسرے لوگوں کو حرکت میں لاتا ہے۔

سُرخ سوئیٹر والے سلفی کی بات اس سچائی کی بازگشت تھی۔ اس کا ایک ایک لفظ امٹ اور لافانی تھا۔ اور اپنے آپ کو اس دور کی سچائی ثابت کرنے کے لئے فضا میں گونج رہی تھی۔

(۱۸)

کوشل کو اس میدان نے اسکے ماحول سے عشق ہو گیا ہے گھنٹوں یہاں بیٹھے رہنا۔ ان جانی وسعتوں میں ۔۔۔ بے کنار خلاؤں میں جھانکتے رہنا اچھا لگتا ہے۔ وہ ساکن وصامت رہنے کی کوشش کرتا ہے لیکن وہ ساکن وصامت رہ نہیں سکتا۔ نئے نئے خیالات اس کے ذہن میں اٹھتے رہتے ہیں اور مجسم ہو کر رات کے تاریک اور دھندلے ماحول میں رقص کرنے لگتے ہیں۔

آج وہ بہت دنوں کے بعد ادھر آیا تھا۔ اس کے دو سبب تھے۔ ایک تو کام کا بوجھ بہت بڑھ گیا تھا۔ دوسرے اس کے ساتھی شاعر کو نئی درسی کتابیں لکھنے اور ترجمہ کرنے پر لگا دیا گیا تھا۔ اور پروف پڑھنے کا سارا کام اس کے سر پر آپڑا تھا۔ یہ نئی کتابیں پیش کرنے کے دن تھے اس لئے پروف اتنے آتے تھے کہ سر کھجلانے کی بھی فرصت نہیں ملتی تھی۔ دفتر میں جو کام ختم نہیں ہوتا تھا۔ وہ گھر لے آنا پڑتا تھا۔ اور وہ رات کو بارہ ایک بجے تک بیٹھا پروف دیکھا کرتا تھا۔ جو کام دفتر میں آٹھ گھنٹے جان مار کر کرنا پڑتا ہو اور پھر بھی اتنا معاوضہ نہ ملتا ہو کہ زندگی آرام سے گذر سکے۔ وہی کام رات کو بھی کرنے وقت

اس کی روح بے چین ہو اٹھتی اور دل بغاوت پر آمادہ ہو جاتا۔ لیکن کچھ پیسے زیادہ مل جانے کی امید میں گرم سوٹ سِل جانے کی ہوس میں وہ گردن جھکائے کام کرتا رہتا۔ کرتا رہتا اور جب سوتا تو اتنا تھک جاتا کہ صبح دفتر جانے کے وقت ہی آنکھ کھلتی۔

وہ پندرہ بیس دن اس اوور ٹائم کے چکر میں پڑا رہا۔ ادھر آنے کی فرصت ہی نہیں ملی۔

دوسری وجہ یہ تھی کہ سُرخ سوئیٹر والے سلفی کی بات سننے کے بعد دوسرے دن جب ادھر آیا تو وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ میدان میں ایک بھی بھکاری اور ایک بھی جھونپڑی نہیں تھی۔ جمال، رفیق، جھنیا اور مریم سب لوگ جانے کِدھر چلے گئے تھے۔ اس کے دل میں خیال آیا کہ شاید ابراہیم نے شکایت کر دی ہو اور سرکار نے انہیں یہاں سے اٹھا دیا ہو۔

دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ سرکار نے واقعی انہیں وہاں سے اٹھا دیا ہے۔ لیکن ابراہیم یا کِسی اور کی شکایت پر نہیں بلکہ اپنی مرضی سے اٹھایا ہے۔ وہ آزاد بھارت کی راجدھانی کو فقیروں، بھک منگوں اور کوڑے کرکٹ سے صاف کرنا چاہتی ہے۔ سرکار نے ایک بھکاری گھر بنا دیا تھا۔ تمام فقیروں اور نکمے لوگوں کو پکڑ پکڑ کر وہیں بھیجا جا رہا تھا۔ میدان میں بنی ہوئی جھونپڑیاں پولیس نے اٹھا دی تھیں۔ بعض لوگ انہیں آتے دیکھ کر اِدھر اُدھر بھاگ گئے تھے۔ اور باقی سب بھکاری گھر میں بھیج دئے گئے تھے۔

کوشل بہت دیر تک بیٹھا سوچتا رہا۔ کہ کیا زخموں پر مرہم لگا دینے ہی

سے کوڑھ کا علاج ممکن ہے؟ جس سماج کے جڑ میں گھن لگا ہوا ہو۔ جو لمحہ بہ لمحہ ٹوٹ رہا ہو۔ کیا اسے بھکاریوں اور بیکاروں سے پاک کر دینا ممکن ہے؟ جہاں سینکڑوں ہزاروں انسان ہر روز بھکاری بننے پر مجبور ہوں محنت کرنے والوں کو بھی کام نہ ملتا ہو۔ وہاں ایک بھکاری گھر بنا دینے سے کیا بنتا ہے؟ یہ سب خود فریبی ہے۔ دھوکا ہے اور بیہودہ کوشش ہے۔ کوڑھ کے داغ گردن سے نیچے ہوں تو قمیص، کوٹ پہنکر چھپ سکتے ہیں لیکن چہرے کے داغ کیسے چھپیں گے؟

وہ اس دن کافی دیر تک بیٹھا خلاء میں جھانکتا اور سوچتا رہا۔ اسے یہ واقعہ بہت ہی عجیب معلوم ہو رہا تھا۔

اس کے بعد وہ اتنے دن ادھر نہیں آیا۔ آنے کی فرصت نہیں ملی۔ لیکن اس واقعہ پر وہ اکثر غور کرتا تھا۔ دفتر آتے جاتے اسے کتنے ہی بھکاری ملتے تھے اور ریلوے پل پر قطار در قطار بیٹھے دکھائی دیتے تھے اور بیکاروں کی تو کچھ گنتی ہی نہیں تھی۔ ان کے دفتر میں کتنے ہی پڑھے لکھے نوجوان ہر روز کام پوچھنے آتے تھے اور مایوس لوٹ جاتے تھے۔ کمپوزیٹروں کو شکایت تھی کہ آدمی اتنے بڑھ گئے ہیں کہ کسی بھی پریس میں کام نہیں ملتا۔ اور مالک پہلے جو کام تنخواہ پر کرواتے تھے۔ اب ٹھیکے پر کرواتے ہیں جس سے کچھ بھی نہیں بنتا۔ اس بڑھتی ہوئی بیکاری اور مہنگائی کو دیکھ کر پریس اور دفتر کے سب لوگ دبے رہتے تھے اور مالک جتنا کام کرنے کو کہتا تھا چپ چاپ کر دیتے تھے۔

کوشل اس لئے ادھر نہیں آسکا تھا لیکن میدان اور میدان کے باسی اس کے ذہن میں رہتے تھے۔ ایک دن شام کو جب وہ دفتر سے لوٹ رہا تھا

اس نے جھنیا کو دیکھا۔ وہ بازار میں بھیک مانگتی پھرتی تھی۔ وہ بہت ہی پریشان اور دکھی معلوم ہوتی تھی۔ جسم پہلے سے کہیں زیادہ کمزور تھا۔ ہاتھ پاؤں میں رعشہ بھی بڑھ گیا تھا۔ قدم قدم پر سوکھی ٹہنی کی طرح لڑکھڑاتی تھی۔ جیسے اب گری۔ اب گری۔

کوشل نے آگے بڑھ کر ایک چونّی اس کے ہاتھ پر رکھ دی۔ جھنیا نے گردن اٹھا کر ایک نظر اس کی طرف دیکھا اور پھر آگے چلی گئی۔ کوشل کو پہچانا تک نہیں۔

× × × × × ×

کوشل آج پھر میدان میں آیا ہے اور بیٹھا سوچ رہا ہے لیکن سوچ میں کوئی تسلسل نہیں ہے کیونکہ بیک وقت بہت سے خیال اس کے ذہن میں گھوم رہے ہیں۔ بات سے بات نکلتی ہے اور ان خیالات میں گڈمڈ ہو جاتی ہے۔

فضا خاموش ہے اور رات بھیگی ہوئی ہے۔ آسمان پر تارے ٹمٹما رہے ہیں۔ بادل نہ ہونے پر بھی مطلع صاف نہیں ہے۔ ایک دھندلا پن چاروں طرف چھایا ہوا ہے۔ جیسے دھواں ماحول میں رچ بس گیا ہو۔ اس کا ایک لازمی جزو بن چکا ہو۔

اوپر آسمان ہے اور نیچے میدان پھیلا ہوا ہے۔ کوشل نے ان جانے ہی گھاس کا ایک تنکا توڑ لیا ہے اور دانتوں میں چبا رہا ہے وہ اس تنکے کو چبا رہا ہے اور اپنے کام اور اپنے دفتر کی بات سوچ رہا ہے۔ سکولوں کی نئی کتابیں تیار ہو رہی تھیں۔ نئے ہندوستان کی نئی کتابیں! رائے صاحب برج بہاری لال

جن کے ہاں وہ ملازم تھا۔ پہلے لاہور میں رہتے تھے۔ آزادی یعنی تقسیم کے بعد یہاں چلے آئے ہیں اور یہاں بھی کتابیں چھاپنے کا کاروبار کرتے ہیں۔ جو کتابیں پہلے اردو میں چھپتی تھیں اب وہ ہندی میں چھپتی ہیں۔ کیونکہ اب ہندی راشٹر بھاشا ہے۔ کتابیں کچھ نئی لکھوائی گئی ہیں۔ ورنہ اردو کی اپنی کتابوں کا ہندی میں ترجمہ کر دیا گیا ہے اور ان میں انگریز بادشاہوں اور وائسرائوں کی جگہ کانگرسی لیڈروں اور وزیروں کی تصویریں لگا دی گئی ہیں۔ اس کے علاوہ ان میں کوئی فرق۔ کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ کتابیں وہی ہیں۔ چھاپنے اور پڑھانے کا ڈھنگ وہی ہے۔ اور غلامی کا فلسفہ وہی ہے "ہندوستان کی آب و ہوا زیادہ گرم اور زیادہ سرد ہے۔ اس لئے یہاں کے باشندے کاہل اور سست ہوتے ہیں۔"

"کاہل اور سُست!" کوشل نے اونچی آواز میں دہرایا اور طنزاً ہنس پڑا۔ اسے رائے صاحب برج بہاری لال! اور اسکے بیٹے یاد آئے۔ جو سردیوں میں ہیٹر سینکتے ہیں اور گرمیوں میں خس خس کی ٹٹیاں لگا کر پنکھے کی ٹھنڈی ہوا کھاتے ہیں۔ کرسیوں پر بیٹھے بیٹھے اونگھ جاتے ہیں اور کام کی نگرانی خراٹوں سے کرتے ہیں۔

وہ کافی دیر تک ان کے بارے میں اور "کاہل اور سُست" کے فلسفے کے بارے میں سوچتا اور خلاء میں جھانکتا رہا۔

پھر اسے دفتر کے دوسرے لوگوں کمپوزیٹروں اور کلرکوں کی۔ اپنی اور اپنے ساتھ کام کرنے والے پروف ریڈروں کی بات یاد آئی۔ جنہیں اونگھنا تو درکنار، سر کھجلانے کی بھی فرصت نہیں ملتی۔ ماتھے کا پسینہ پونچھتے رہتے ہیں۔ اور کام کرتے رہتے ہیں۔ وہ اپنے سامنے کتنے ہی سوکھے اور ننگے ہوئے

چہرے دیکھ رہا تھا اور ان کے متعلق سوچ رہا تھا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے یہ لوگ صدیوں سے یونہی سر جھکائے کام کر رہے ہوں۔ ان کے چہرے سوکھتے اور اترتے جا رہے ہوں اور دوسری طرف رائے صاحب اور ان کے بیٹوں کی گردنیں پھولتی اور موٹی ہوتی جا رہی ہیں۔

"کاہل اور سست!" اس نے پھر اونچی آواز میں دوہرایا۔ اور وہ پھر دفتر کی بات سوچنے لگا۔ پروف پڑھتے پڑھتے اس کا کچومر نکل جاتا تھا۔ آنکھیں دھندلا جاتی تھیں۔ اور گردن دکھنے لگتی تھی۔ کام سے اکتا کر کہیں بھاگ جانے کو جی چاہتا تھا۔ مگر بھاگ کر کہاں جائے؟ کام نہیں ملتا۔ جب کام نہ ملے تو روٹی اور کپڑا بھی نہیں ملتا۔ جینا دشوار ہو جاتا ہے۔ اور جینا ضروری ہے۔ اس نے اب تک بھاگ کر بہت دیکھ لیا تھا۔ وہ اخبار نویسی۔ پروف ریڈری کمپوزیٹری۔ اور بھی کئی دھندے باری باری سے کر چکا تھا۔ اور ہر مرتبہ مہینوں بے کار گھومنا اور بھوکا رہنا پڑا تھا۔ "سچی بات یہ ہے کہ تم خود کام کرنا نہیں چاہتے۔ تمہیں نکمے اور نٹھلے گھومنا پسند ہے!"

جب وہ پروف دیکھتے دیکھتے بہت تھک جاتا تھا اور گردن اٹھا کر کچھ سوچنے لگتا تھا۔ تو اسے اپنی بھوک اور بے کاری کے وہ دن اور دوستوں کے طعنے یاد آ جاتے تھے اور سر آپ ہی آپ جھک جاتا تھا۔ اور وہ پھر پروف پڑھنے لگتا تھا۔ گردن دکھتی ہے آنکھیں دھندلاتی ہیں۔ کام کرنا ضروری ہے۔ کام سے روٹی ملتی ہے۔ وہ پروف پڑھتا ہے۔ اس کا ساتھی شاعر اور ایک شاستری جی کتابیں لکھتے اور ترجمہ کرتے ہیں۔ جب کتابیں لکھنے کا کام

ختم ہو جاتا ہے۔ تو وہ بھی پروف پڑھنے لگتے ہیں۔ کام چاہے کچھ بھی کریں۔ کتابیں لکھیں یا پروف پڑھیں۔ تنخواہ وہی ڈیڑھ سو روپے ماہوار ملتی ہے۔ رائے صاحب ان کتابوں سے لاکھوں کماتے ہیں اور ان ہیڈ ماسٹروں۔ پروفیسروں اور پرنسپلوں کو بھی ہزاروں ملتے ہیں۔ جن کے نام سے یہ کتابیں چھپتی ہیں۔ اور جو انہیں سرکار سے منظور کرواتے ہیں اور کورس میں لگواتے ہیں.....

اور کتابیں لکھنے والے شاستری جی کی پتنی کتنے ہی دن بیمار رہ کر بنا علاج کے مر گئی۔ وہ اب اپنی ایک ننھی بچی کو سائیکل پر بٹھا کر دفتر میں اپنے ساتھ لاتے ہیں اور اسے بہلا پھسلا کر پاس بٹھائے رکھتے ہیں۔ اس کا شاعر ساتھی ابھی تک کنوارہ ہے اور کنوارا ہی رہ کر زندگی بسر کر دینا چاہتا ہے کوشل خود بھی کنوارا ہے اور جوانی کی حسرتوں کو سینے میں دبائے رکھتا ہے۔ لیکن دفتر میں کام کرنے والے سینکڑوں آدمی کنوارے نہیں ہیں اور کنوارا رہنا کوئی دھرم اور ثواب کا کام بھی نہیں ہے۔ بے چارے اس تنخواہ میں گھر گرہستی کا خرچ چلاتے ہیں۔ دفتر سے پیشگی اور دوستوں سے قرض لیتے ہیں۔ زندگی کے تسلسل کو جاری رکھنے کے لئے تل تل کر کے گھلتے اور سوکھتے جا رہے ہیں۔ کوشل کو معلوم ہے کہ ان میں سے اکثر لوگ زندگی کے آخری دنوں میں تپ دق کے مریض ہو کر نکلتے ہیں۔ انہیں کسی طرح کی امداد نہیں ملتی اور ...... اور بنا علاج کے فاقے کرتے ہوئے .....

"کاہل اور سست!" کوشل طنزاً ہنس پڑا۔

ذرا سکون ملا تو پھر سوچنے لگا۔ اُسے ایسا محسوس ہوا۔ جیسے وہ دفتر میں بیٹھا پروف پڑھ رہا ہے۔ تپ دق کے لاکھوں کروڑوں کیڑے سر سر کرتے اس کے گرد گھوم رہے ہیں۔ منہ کھولے اس کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ ان کی شکلیں بھیانک ہیں۔ اور ان کا قد لمحہ بہ لمحہ بڑھ رہا ہے۔ وہ ان کے خوف سے لرز اٹھا ہے۔ دفتر سے بھاگ نکلا ہے اور بھاگ کر اس میدان میں آ بیٹھا ہے۔ اس کی سانس تیز تیز چل رہی ہے۔ شاید تپ دق کے جراثیم اب بھی اس کا پیچھا کر رہے ہیں۔

اس نے ایک لمبی۔ بہت لمبی سانس چھوڑی اور طبیعت کو یوں کچھ سکون میسر آیا۔ اب وہ دفتر کے بارے میں نہ سوچ کر اس میدان کے بارے میں سوچ رہا ہے۔ بلکہ یوں کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ کہ وہ بے دلی سے میدان کی دھندلی فضا میں جھانک رہا ہے۔ وہ سوچنا ترک کر کے خاموش اور شانت ہو جانا چاہتا ہے۔ اس لئے وہ میدان کی وسعتوں میں بلا مطلب جھانک رہا ہے۔

رات کافی گذر چکی ہے اور خاموشی بڑھتی جا رہی ہے سڑک پر کبھی کبھی جو موٹر آ جاتی تھی۔ وہ بھی اب نہیں آتی۔ میدان سو رہا ہے۔ سڑک سو رہی ہے۔ سارا ماحول نیند میں ڈوبا جا رہا ہے لیکن کوشل کی آنکھوں میں نیند نہیں ہے۔ وہ خلاء میں جھانک رہا ہے۔ اندھیرا ابھی اونگھ رہا ہے۔ اور لحظہ بہ لحظہ گہرا ہوتا جا رہا ہے۔ تارے گو بدستور ٹمٹما رہے ہیں لیکن پاس اور دُور کی بہت سی بتیاں بجھ گئی ہیں اور دُھواں

اور دھند بڑھتی جا رہی ہے فضا میں گھلتی اور ملتی جا رہی ہے۔ اندھیرا ٹھوس اور مجسّم ہو گیا جان پڑتا ہے۔ اس میں جھانکتے ہوئے خوف آتا ہے۔ کوشل کی آنکھیں ان دو لال لال بتیوں پر گڑی ہوئی ہیں جو لال قلعے پر دو اونچے اونچے بالنسوں پر چمک رہی ہیں۔

"لال بتیاں!" کوشل بڑبڑایا۔ اور جانے کیا سوچ کر مسکرا دیا۔ اس کا دماغ پھر حرکت میں آگیا ہے۔ اور وہ پھر سوچ رہا ہے۔ اس کے دل میں کسی طرح کا خوف اور کوئی شک و شبہ نہیں ہے۔ اس کا دماغ صاف اور خیالات واضح ہیں۔ ہوا کچھ تیز اور ٹھنڈی ہے۔ لیکن اچھی لگتی ہے۔ اس کے دل میں ایک باغی جذبہ نے سر اٹھایا ہے۔ اور اس ٹھوس اندھیرے اور دُھندلی فضا میں وہ نڈر جھانک رہا ہے۔

وہ جھانکتا اور سوچتا رہا۔ رفتہ رفتہ اس کی سوچ بھی ٹھوس اور مجسّم ہوتی گئی۔ اسے ایسا لگا جیسے اس میدان کے لاکھوں کروڑوں باسی اس کے گرد گھوم رہے ہوں۔ اس اندھیرے ماحول پر چھائے ہوئے ہوں وہ بھی ٹھوس اور مجسّم ہوں۔ کوشل نے سُن رکھا تھا۔ کہ اگر آدمی کوئی حسرت اور ارمان دل میں لئے مر جائے تو اس کی روح سدا کے لئے بھوت پریت بن کر بھٹکتی رہتی ہے۔ نہ جانے کتنے لوگ صدیوں سے حسرتیں اور ارمان دل میں لئے مر جاتے ہیں۔ یہ یقیناً انہیں کی روحیں ہیں جو بھوت بن کر اندھیرے میں گھوم رہی ہیں عجیب عجیب حرکتیں کر رہی ہیں۔ اور سوانگ بھر بھر کر ایک دوسرے کا مُنہ چڑا رہی ہیں۔ کبھی ناچتی اور گاتی

ہیں اور کبھی کھلکھلا کر ہنسنے لگتی ہیں ۔ جیسے وہ اس ماحول کی، اپنے آپ کی اور پورے سماج کی کھلی اڑا رہی ہیں ۔ ایک دم چنچل اور شوخ ہو اٹھی ہیں ۔

کوشل اس اندھیرے میں اور دھندلے ماحول میں جھانکتا رہا ۔ ان بھوت پریتوں کی عجیب عجیب حرکتیں دیکھتا اور ان کے بارے میں سوچتا رہا ۔ یہ بھوت پریت اس کے گرد گھوم رہے تھے ۔ میدان میں بھرے پڑے تھے ۔ ناچ اور گا رہے تھے ۔ اور کھلکھلا کر ہنس رہے تھے ۔

ساکن اور خاموش فضا میں ان کے ناچ گانے کی آوازیں اور قہقہے صاف سنائی دیتے تھے ۔ وہ اس ماحول کی، اپنے آپ کی اور سارے سماج کی کھلّی اڑا رہے تھے ۔ ان کے انگ انگ میں ہر ایک حرکت اور کنایہ میں بغاوت کا جذبہ بھرا ہوا تھا ۔ جیسے کچلی ہوئی حسرتیں اور ارمان مجسّم ہو کر ناچ رہے ہوں ہنس رہے ہوں منہ چڑھا چڑھا کر کسی سے انتقام لے رہے ہوں ۔ جانے یہ بھوت پریت کب سے اسی طرح ٹھٹکتے ناچتے اور گاتے رہے ہوں ۔ اور اب یک بیک شوخ اور باغی ہو اٹھے ہوں ۔

رفتہ رفتہ شور بڑھتا گیا ۔ اور پھر ایک دم دھوم دھمّکا ۔ دھوم دھمّکا ۔ گویا قیامت مچ گئی ۔ جیسے ایک ساتھ کروڑوں پاؤں دھرتی پر پڑ رہے ہوں ۔ کروڑوں انسان ایک ساتھ چلا رہے ہوں اور آپس میں

دھکم پیل کر رہے ہوں۔ شور کے مارے کان پھٹے جا رہے تھے۔ مگر کوشل چپ چاپ بیٹھا سن رہا تھا۔ دیکھ رہا تھا۔ اس کے دل میں کسی طرح کا خوف نہیں تھا۔ بلکہ وہ اپنے اندر ایک عجیب مسرت محسوس کر رہا تھا۔ جیسے یہ بھوت پریت کچلے ہوئے ارمانوں اور حسرتوں کا دھوم دھمکا نہ ہوں۔ خود زندگی ناچ رہی ہو۔ جینے کا حق مانگ رہی ہو۔ اس لحظہ بہ لحظہ ٹوٹ رہے سماج کو ایک زور کا دھکا دے کر انصاف اور صداقت کا آخری اور تاریخی فیصلہ کر دینا چاہتی ہوں ۔۔۔۔

تپ دق کے کلبلاتے جراثیم اور یہ خوفناک منظر!

کوشل سوچنا بند کر کے پھر اندھیرے میں جھانکنے لگا۔ لیکن اب اس کی طبیعت میں سکون تھا۔ اور خیالات واضح تھے۔ سوچنا بند کر دینا اس کے بس کا روگ نہیں تھا۔ ہوا تیز اور خنک ہوتی جا رہی تھی۔ اور تاریکی میں سے چہرے اُبھر اُبھر کر سامنے آ رہے تھے۔ عبد الصمد، جمال اور مریم —— وہ انہیں پہچان سکتا تھا۔ اور ان سے بات کر سکتا تھا۔ وہ انہیں دیکھتا اور ان سے باتیں کرتا رہا۔ دیکھتے دیکھتے بیک وقت بہت سے چہرے اندھیرے میں اُبھرے اور ایک دوسرے میں خلط ملط ہو گئے۔ وہ اُبھرتے اور خلط ملط ہوتے گئے۔ سینکڑوں، ہزاروں اور لاکھوں چہرے خلط ملط ہو کر ایک ہی جسم میں سما گئے۔ اب کوشل کے سامنے صرف ایک ہی جسم تھا۔ لمبا۔ چوڑا۔ اُونچا اور دیو قد جسم! وہ سارے ماحول میں پھیلا ہوا تھا۔ جیسے خود میدان کی روح مجسم ہو اٹھی ہو۔ اس کا سر ننگا اور گھٹا ہوا

تھا۔ اس نے سُرخ سویٹر پہن رکھا تھا۔ اور اس کے چوڑے ماتھے پر شو جی کی تیسری آنکھ چمک رہی تھی۔ اس نے سر گھما کر ساری کائنات پر نظر ڈالی اور بڑی سنجیدگی سے پیشین گوئی کی:۔

"یہ جگ بدلے گا۔ ضرور بدلے گا۔ اور تبھی انسان۔ انسان بنے گا!"

سوم پرکاش ساہنی پبلشر نے اشوک پرنٹنگ پریس دریا گنج دہلی میں
چھپوا کر برائے لاجپت رائے اینڈ سنز تاجران کتب اردو بازار دہلی شائع کیا!